شذرات

یوم اقبال پر جناب جاوید احمد غامدی کا خطاب	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	۲

قرآنیات

النساء (۴: ۱۰۵-۱۱۵)	جاوید احمد غامدی	۷

نقطۂ نظر

علامہ جاوید احمد غامدی کا تصور ''کتاب''	حافظ محمد زبیر	۱۳

نقد و نظر

غامدی صاحب کے تصور 'کتاب' پر اعتراضات کا جائزہ	منظور الحسن	۴۷

مقامات

دین حق	جاوید احمد غامدی	۷۳

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مرتب: منظور الحسن

یوم اقبال پر جناب جاوید احمد غامدی کا خطاب

[یہ جناب جاوید احمد غامدی کا خطاب ہے۔ یہ خطاب انھوں نے ۹ نومبر ۲۰۰۴ کو ''مرکزیہ مجلس اقبال'' کی سالانہ تقریب کے موقع پر الحمرا ہال لاہور میں کیا تھا۔ قارئین کے افادے کے لیے اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ مدیر]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اقبال کی آواز اس عہد کی خوب صورت ترین آواز تھی۔ وہ ہمارا بے مثل شاعر، مفکر اور حکیم ہے۔ ہم نے اسے اگر شاعر مشرق کہا، ترجمان حقیقت کہا، حکیم الامت کہا تو بے جا نہیں کہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے قافلے آج بھی کہیں جادہ پیما ہوتے ہیں تو اقبال کی آواز ہی ان کے لیے بانگ درا بنتی ہے اور نوجوان آج بھی کہیں مائل پرواز ہوتے ہیں تو بال جبریل ہی سے اپنے لیے شہ پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اقبال کے بارے میں ان حقائق کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم اس کے اشعار گنگناتے ہیں، اس کی زندگی اور اس کے افکار کے بارے میں مقالے اور تقریریں سنتے ہیں، اس کی شان میں قصیدے کہتے ہیں اور اس کی یاد میں منعقد کی گئی ایسی ہی مجلسوں میں اسے بڑھ چڑھ کر خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ یوم اقبال کی اس تقریب میں اگر میں بھی اپنے الفاظ اسی طرح مدحت اقبال کی نذر کروں تو یہ کار بے خیر نہ ہوگا، مگر میرے خیال میں اس وقت جس موضوع کو سب سے بڑھ کر زیر بحث آنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اقبال کے بعد ہم کس جگہ کھڑے ہیں۔

پہلا مسئلہ جو اقبال کے بعد ہمیں درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے اس شاعر نے قومیت کا جو تصور پیش کیا ہے، کیا وہ زمینی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے یا ایسا آئیڈیل ہے جس تک کبھی رسائی نہیں ہو سکتی؟

ہم جانتے ہیں کہ اقبال ایک زمانے تک وطنیت کے نغمے گاتا رہا، لیکن پھر وہ وقت بھی آیا، جب اس نے پورے زور کے ساتھ مسلم قومیت کا تصور پیش کیا۔ اس نے لوگوں کو باور کرایا کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد رنگ، نسل یا وطن نہیں ہے، بلکہ خود اسلام ہے۔ اپنے مضامین، اپنی شاعری اور اپنے خطبات میں اس نے یہ مضمون، اگر میر انیس کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو فی الواقع سو رنگ سے باندھا ہے۔ آپ کو اس کی نظم ''وطنیت بحیثیت سیاسی تصور'' کے یہ اشعار تو یاد ہوں گے۔ اس نے کہا ہے:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

وہ اس معاملے میں اس انتہا تک چلا گیا کہ جب مولانا حسین احمد مدنی جیسے جلیل القدر عالم نے کسی موقع پر کہا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں تو اس نے سخت تنبیہ کے انداز میں فرمایا:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ست

آج ہم سے ہماری نئی نسلیں یہ سوال کرتی ہیں کہ اقبال کا دیا ہوا مسلم قومیت کا یہ آفاقی تصور اگر درست ہے تو پھر مسلمان ممالک کی آپس کی سرحدوں کے کیا معنی ہیں؟ ہندوستان میں باقی رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کا کیا اسٹیٹس ہے؟ کیا وجہ ہے کہ مصور پاکستان کے پاکستان میں جب بنگلہ دیش اور افغانستان سے مہاجرین آئے تو انھیں اس ملک کے باشندے تصور کرنے سے انکار کر دیا گیا؟ کیا سبب ہے کہ آج ہماری قوم کی زبان پر یہ نعرہ جاری ہے کہ سب سے پہلے پاکستان؟

اقبال کے فرزند جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''اپنا گریباں چاک'' میں اپنے والد کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں انھوں نے اسی طرح کے زمینی حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے اپنے والد کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ جب آپ انگلستان گئے تھے اور میں نے آپ سے انگریزی باجا لانے کی فرمایش کی تھی تو میری یہ خواہش بھی آپ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے آسمانی افکار سے متصادم ہوگئی تھی اور آپ نے فرمایا تھا:

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

انھوں نے لکھا ہے کہ آج بھی کچھ اسی طرح کے زمینی حقائق اس امت کو درپیش ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ان نہایت اہم مسائل کی نشان دہی کی ہے جن سے اس وقت امت مسلمہ دوچار ہے۔ اس امر کی ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دانش فرزند اقبال کی طرف سے نشان زد کیے گئے ان مسائل کی طرف متوجہ ہوتے، مگر افسوس ہے کہ نہ کسی نے اسے موضوع بنایا اور نہ اس کا کوئی نوٹس لیا اور ڈاکٹر صاحب بھی غالباً یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ اقبال اگر اب بھی ان کے خط کا جواب دیں تو غالباً یہی دیں گے:

نے افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم

بہر حال قومیت کے آفاقی تصور کے حوالے سے نظریے اور عمل کا جو تصادم پیدا ہو گیا ہے، وہ ہماری نئی نسل کے ذہن میں ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ یہ پہلا سوال ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا جو خواب دیکھا تھا، وہ اگرچہ بڑا خوب صورت اور دل نواز تھا، مگر اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جو لائحۂ عمل ہم نے آج تک اختیار کر رکھا ہے، کیا وہ درست ہے یا اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے؟

عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے ہم نے جو لائحۂ عمل اختیار کیا، اس کی ہمیشہ دو جہتیں رہی ہیں: ایک یہ کہ ہم نے ہر ممکن طریقے سے علما کو ایوان اقتدار میں پہنچا دینے کی کوشش کی اور دوسرے یہ کہ ہر موقع پر مسلمانوں کو جہاد و قتال کے ذریعے سے لڑ مرنے کی ترغیب دی۔ پہلی کاوش کے نتائج یہ ہیں کہ سعودی عرب میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے جو انقلاب برپا ہوا، اس نے بادشاہت کی صورت اختیار کی، ایران میں یہ تجربہ پاپائیت میں تبدیل ہو گیا اور افغانستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد ملائیت کی صورت میں ظہور پزیر ہوئی۔ چنانچہ اقبال ہی کے الفاظ میں مسلمان آج بھی اسی مخاطبت کے مستحق ہیں کہ اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری۔

جہاں تک دوسری کاوش کا تعلق ہے تو اس کے نتائج بھی آپ عراق سے لے کر افغانستان اور فلسطین سے لے کر چیچنیا تک، ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔

کیا اقبال نے بھی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے یہی لائحۂ عمل تجویز کیا تھا یا وہ اس سے مختلف تھا، اور اگر اس کا تجویز کردہ لائحۂ عمل یہی تھا تو پھر اس سے نکلنے والے نتائج ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں؟ یہ دوسرا سوال ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ شریعت کا جوڑھانچا اس وقت موجود ہے، وہ نہ اسلام کی دعوت کے لیے موزوں ہے اور نہ اس کے نفاذ کے لیے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب Reconstruction of religious thought in islam میں اسے اصولی لحاظ سے موضوع بنایا۔ انھوں نے ان اہم عملی مسائل کی فہرست بندی بھی کی جن کا شریعت کے اس پیش کردہ ڈھانچے میں کوئی حل موجود نہیں ہے۔ یہ فہرست آج بھی اقبال میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال کی تشویش بالکل بجا تھی، مگر المیہ یہ ہے کہ اسے کسی نے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھا۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم شریعت اور اسے اخذ کرنے کے اصولوں کا پوری طرح جائزہ لیتے، تحقیق و جستجو کے مقامات کو متعین کرتے، اجتہاد کی راہوں کو دریافت کرتے اور اپنے لیے ایسی فقہ ترتیب دیتے جو ایک طرف قرآن و سنت کے عین مطابق ہوتی اور دوسری طرف دور جدید کے مسائل کو تشفی بخش طریقے سے حل کرتی، مگر ہم نے اس کے برعکس تقلید جامد کا رویہ اختیار کرتے ہوئے انھی قوانین سے چمٹے رہنے کا فیصلہ کیا جو ہمارے قدیم فقہا نے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے تشکیل دیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم نے اسلامی شریعت کے نام پر جو کچھ دعوت دی ہے اور جو کچھ نافذ کیا ہے، وہ اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اسے نہ اپنی قوم کے ذہین عناصر سے منوایا جا سکتا اور نہ دنیا کی غیر مسلم اقوام کے سامنے اعتماد سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ طرز عمل درست ہے یا اس معاملے میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ تیسرا سوال ہے۔

یہ وہ سوال ہیں جو ہمیں اس وقت امت کی سطح پر درپیش ہیں۔ میں مرکزیہ مجلس اقبال کو یہ توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ان مسائل کے بارے میں قوم کے ذہین عناصر کو متوجہ کرے۔ ان مسائل کی نوعیت محض افراد کی غلطیوں کی نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ اب ملت کے گناہ بن گئے ہیں اور اقبال کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۱۷)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اِنَّـآ اَنۡـزَلۡـنَـآ اِلَیۡكَ الۡـكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ وَ لَا
تَكُنۡ لِّلۡخَآئِنِیۡنَ خَصِیۡمًا﴿۱۰۵﴾ وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا﴿۱۰۶﴾
وَلَا تُـجَـادِلۡ عَـنِ الَّـذِیۡنَ یَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ، اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنۡ كَانَ

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ اللہ نے جو کچھ تمھیں دکھایا ہے[۱۷۶]، اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو (کہ اِن میں سے کون مخلص ہے اور کون منافق) اور اِن بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو اور اللہ سے معافی کی درخواست کرو۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۱۷۷]۔ اُن لوگوں کی وکالت نہ کرو[۱۷۸] جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں

[۱۷۶] یعنی اِس طرح بتایا ہے کہ گویا بچشم سر دکھا دیا ہے۔

[۱۷۷] اِن آیتوں میں خطاب اگرچہ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن روے سخن اگر غور کیجیے تو اُنھی منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ آگے 'هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ' کے الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب اصل مخاطبین سے بے پروائی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

[۱۷۸] اصل میں لفظ 'مجادلة' آیا ہے۔ اِس کے معنی جھگڑنے کے بھی ہیں اور الحاح واصرار کے ساتھ کسی کی وکالت

خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ
اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ، وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾
هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ
عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ
يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ

کرتا جو بدعہد ہے اور حق تلفی کرنے والا ہے۔ یہ لوگوں سے چھپ سکتے ہیں، مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ وہ تو اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ اُس کی مرضی کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اُن میں سے ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۰۵-۱۰۸

یہ تم ہو کہ دنیا کی زندگی میں تو اِن (مجرموں) کی طرف سے تم نے جھگڑا کر لیا، لیکن قیامت کے دن کون اِن کی طرف سے اللہ سے جھگڑا کرے گا یا کون اِن کا ذمہ دار بنے گا؟[۱۷۹] ہاں، جو کسی برائی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور بڑی شفقت کرنے

کرنے اور تذلل کے ساتھ شکوہ اور شکایت کرنے کے بھی۔ یہاں یہ اِسی دوسرے مفہوم میں ہے۔

[۱۷۹] اصل میں لفظ 'وکیل' آیا ہے۔ اِس کے ساتھ 'علٰی' کا صلہ ہو تو عربی زبان میں یہ جس طرح نگران اور ضامن کے معنی میں آتا ہے، اِسی طرح ذمہ دار اور مسئول کے معنی میں بھی آتا ہے۔ آیت میں اُن لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر منافقین کی حمایت کرتے اور اُن کی صریح غلطیوں کے باوجود اُن کو بری قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آیت ۱۱۵ تک یہ پورا سلسلۂ بیان اِنھی لوگوں کے جواب میں ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس پر تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں جب یہ آیتیں پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بار بار اِس طرف جاتا ہے کہ یہ اُن لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو ان منافقین کی حمایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین سے بحثیں اور مناظرے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اِن منافقین کی اِن خفیہ مجلسوں اور درپردہ سازشوں کی اطلاعات جب حضور کو اور صحابہ کو پہنچتی رہی ہوں گی تو اُن پر کسی نہ کسی نوعیت سے گرفت بھی ہوتی رہی ہوگی۔ اُس وقت اُن کے یہ حمایتی، جن کا اوپر ذکر ہوا، اُن کی صفائی میں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ ، وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ خَطِیۡٓئَۃً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ یَرۡمِ بِہٖ بَرِیۡٓئًا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۱۲﴾

والا پائے گا۔[۱۸۰] (اپنے گناہ دوسروں کو لگا کر یہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) جو برائی کماتا ہے، اُس کا وبال اُسی پر آتا ہے۔ (یہ اللہ کا قانون ہے) اور اللہ علیم وحکیم ہے۔[۱۸۱] (اِنھیں بتاؤ کہ) جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، پھر اُس کی تہمت دوسروں پر لگا دیتا ہے، اُس نے تو ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے۔[۱۸۲] ۱۰۹-۱۱۲

کہتے رہے ہوں گے کہ یہ لوگ تو بڑے مخلص ہیں، یہ تو ملت کے بڑے ہوا خواہ ہیں، اِن کی مجلسوں میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور خیر خواہی کی ہوتی ہیں۔ اور اگر اس ذیل میں کوئی ایسی بات گرفت میں آتی رہی ہو گی جس کا جواب نہ بن آتا ہو گا تو اُس کا الزام، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، کسی ایسے بھلے مانس پر ٹھونک دیتے رہے ہوں گے جس کے حاشیۂ خیال میں بھی وہ بات کبھی نہیں آئی ہو گی۔ ان لوگوں کی اس وکالت کے جواب میں قرآن نے نہایت بلیغ طریقے سے اِن اندرون خانہ سرگوشیوں سے پردہ اٹھایا اور دیکھیے کتنی خوب صورتی سے پردہ اٹھایا ہے کہ ساری بات بھی سامنے آگئی اور مخاطب کے لیے کسی بحث و تردید کی گنجایش بھی باقی نہیں رہی۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۳۸۳)

[۱۸۰] یعنی خدا کی گرفت سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ مجرموں کی حمایت میں دوسرے لوگ اُن کے پشت پناہ بن کر کھڑے ہو جائیں، بلکہ یہ ہے کہ خود مجرم اللہ کی طرف متوجہ ہو، اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور اُس سے مغفرت چاہے۔

[۱۸۱] اِس لیے وہ اِس بات کو کس طرح روا رکھ سکتا ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرے پر ڈال دے۔

[۱۸۲] یہ منافقین کی ایک اور شرارت سے پردہ اٹھایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ لوگ اپنی کسی غلطی یا کسی حق تلفی پر جب گرفت میں آجاتے ہیں تو اعتراف کے بجائے جھوٹ اور بہتان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اُس کا بوجھ کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ خدا سے بریت کا یہ راستہ بھی غلط ہے۔ اِس بہتان اور جھوٹ سے دنیا کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، خدا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ خدا کے ہاں ایسے مجرم نہ صرف اپنے جرم کا بوجھ اٹھائیں گے، بلکہ اپنے اصل جرم پر بہتان اور جھوٹ کا بھی اضافہ کر لیں گے۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۳۸۰)

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ، وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ، وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ، وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ، وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ

تم پر اللہ کی عنایت اور اُس کی رحمت نہ ہوتی، (اے پیغمبر) تو ان میں سے ایک گروہ نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ تمھیں راہ راست سے ہٹا کر رہے گا، دراں حالیکہ وہ اپنے سوا کسی کو راہ راست سے نہیں ہٹا رہے اور نہ تمھیں کوئی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ (وہ تمھیں کس طرح راہ راست سے ہٹا سکتے ہیں)؟ اللہ نے تم پر اپنا قانون اور اپنی حکمت نازل فرمائی ہے اور (اِس طرح) تمھیں وہ چیز سکھائی ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور اُس کی تم پر بڑی عنایت ہے۔۱۱۳

اِن کی سرگوشیوں میں زیادہ تر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں، اُن لوگوں کی سرگوشی میں یقیناً بھلائی ہے جو صدقہ و خیرات کی تلقین کریں یا نیکی کی راہ سجھائیں یا لوگوں کے معاملات کی اصلاح کے لیے کہیں۔ اور جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کریں گے، اُنھیں عنقریب ہم اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ (اِس کے برخلاف) جو راہ ہدایت کے پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کریں گے اور اُن لوگوں کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کریں گے جو تم پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں،[۱۸۳]

---

[۱۸۳] اِس سے مراد صحابۂ کرام ہیں۔ اُن کا راستہ یہ تھا کہ اُنھوں نے جب ایک مرتبہ اللہ کے پیغمبر کو مان لیا تو اُس کے بعد پھر کبھی بدعہدی، بے وفائی، مخالفت اور گریز و فرار کا رویہ اختیار نہیں کیا، بلکہ پورے اخلاص کے ساتھ آپ کی اتباع کی اور جو حکم دیا گیا، اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے۔ لہٰذا یہ ایمان و اخلاص، اتباع و اطاعت اور تسلیم و انقیاد کا راستہ ہے جس کی پیروی ہر مسلمان کو کرنی چاہیے۔ دین کی تعبیر یا اُس کو سمجھنے میں کسی اختلاف سے اِس کا

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ، وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۱۱۵﴾

اُنھیں ہم اُسی راستے پر ڈال دیں گے جس پر وہ خود گئے ہیں[۱۸۴] اور دوزخ میں جھونکیں گے۔ وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۱۸۴] ہدایت وضلالت کے باب میں یہ اللہ کا قانون ہے جو قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر بیان ہوا ہے کہ ہدایت اُنھیں ملتی ہے جو ہدایت کے سچے طالب ہیں اور گمراہی کے حوالے وہی لوگ کیے جاتے ہیں جو اپنے لیے خود گمراہی کا راستہ اختیار کر لیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حافظ محمد زبیر

علامہ جاوید احمد غامدی کا تصور ''کتاب''

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کا تصور کتاب

جیسا کہ سابقہ ابواب میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ غامدی صاحب کے وضع کردہ اصول اہل سنت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بہت سے مسائل میں غامدی صاحب نے خود اپنے وضع کردہ اصولوں سے بھی کلی طور پر انحراف کیا ہے۔ اس کی بعض مثالیں ذیل کی بحثوں میں سامنے آئیں گی۔

غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں لفظ ''کتاب'' سے مراد کلام الٰہی ہے چاہے یہ تورات و انجیل کی شکل میں ہو یا قرآن و زبور کی صورت میں۔ ان کے ماخذ دین میں منسوخ شدہ آسمانی کتابیں تورات و انجیل وغیرہم بھی شامل ہیں۔ غامدی صاحب نے ''کتاب'' کا یہ مفہوم اپنے استاذ امام امین احسن اصلاحی صاحب سے لیا ہے۔ لفظ ''کتاب'' کے اس نادر مفہوم کو غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' اور ان کے استاذ امام کی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں 'ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ' کی تشریح میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''اصول و مبادی'' میں کسی جگہ کتاب کی تعریف بیان نہیں کی۔ انھوں نے ''اصول و مبادی'' کے آغاز میں قرآن کی تعریف بیان کی ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن کتاب الٰہی کا ایک حصہ ہے، کل کتاب نہیں ہے۔ کتاب کے مفہوم میں ان کے نزدیک تورات،

انجیل اور زبور وغیرہ بھی شامل ہیں۔

یہ غامدی صاحب کے تصور کتاب کا ہی نتیجہ ہے کہ خود ان کی طرف سے یا ان کے مریدین کی طرف سے جب بھی کوئی نئی تحقیق سامنے آتی ہے، اس میں اکثر وبیش تر کتب سابقہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک سابقہ کتب سماویہ پر عمل کرنے کی علت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت میں بندوں کے لیے اللہ کی بھیجی گئی شریعت کے احکامات بہت حد تک ایک واضح سنت کی شکل اختیار کر گئے تھے اور حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنی بھی شریعتیں آئیں ان میں نسخ بہت کم ہے، اس لیے امت محمدیہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے ساتھ ساتھ ان تمام شرائع سابقہ کی مخاطب ومتعبد ہے بشرطیکہ کتاب مقدس کی تعلیمات محفوظ ثابت ہو جائیں۔ ان کے نزدیک سابقہ شرائع کے اکثر وبیش تر احکامات اب بھی دین اسلام میں قانون سازی کا ایک بہت بڑا ماخذ ہیں، اگرچہ سابقہ شرائع کے بعض احکامات میں نسخ کے وہ قائل ہیں۔ غامدی صاحب نے اپنے اس موقف کو اپنی کتاب ''میزان'' میں ''دین کی آخری کتاب'' کے عنوان سے صفحہ ۴۷ سے لے کر صفحہ ۵۲ تک مفصل بیان کیا ہے۔ غامدی صاحب کی اس طویل عبارت کا خلاصہ ان کے شاگرد خاص جناب منظور الحسن صاحب درج ذیل الفاظ میں نکال رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں، بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیا کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات، زبور اور انجیل کی صورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے اور قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ (اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے)۔''
>
> (ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴، ۱۱)

اسی لیے سابقہ کتب سماویہ کی تعلیمات جب ان کے خود معین کردہ معیار صدق وکذب پر پوری اترتی ہوں تو وہ ان کتابوں کی آیات سے قرآنی آیات کی طرح کثرت سے استدلال کرتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اصل میں غامدی صاحب نے علت نکالنے میں غلطی کھائی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اور قرآن کے نزول

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے بعد امت محمد یہ سابقہ شرائع کی متعبد نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین اور شریعت جامع اور کامل واکمل ہے۔ بالفرض اگر پچھلی شریعتیں محفوظ بھی ثابت ہو جائیں پھر بھی ان پر عمل نہیں ہوگا الّا یہ کہ کوئی حکم پچھلی شریعتوں میں موجود ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری شریعت میں بھی ثابت رکھا گیا ہو یا اس کی تصدیق مذکور ہو، یعنی اس پر عمل اس وجہ سے کیا جائے گا کہ وہ ہماری شریعت میں ثابت یا مذکور ہے نہ کہ اس پر عمل پچھلی شریعت کی بنا پر ہوگا۔ اس کی تفصیلات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ غامدی صاحب کے نزدیک حضرت ابراہیم کے بعد آنے والی تمام شریعتیں تقریباً کامل تھیں اور ہر دور کی تہذیب و تمدن کے لیے رہنمائی کی صلاحیت رکھتی تھیں، جبکہ ہم صرف اس پہلو سے تمام سابقہ شرائع کو کامل مانتے ہیں کہ وہ خاص ادوار کے لیے کامل ہدایت تھیں جبکہ زمان و مکان کی تخصیص کے بغیر رہتی دنیا تک آپ کی شریعت کے علاوہ باقی تمام شریعتیں ناقص ہیں۔ پچھلی آسمانی کتابیں اپنے مخصوص دور تک کے لیے تھیں اور قرآن کے آنے کے بعد ان کی، تشریعی نقطۂ نظر سے، ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سابقہ شرائع سے استدلال کرنے کے غامدی صاحب کے اصول

سابقہ شرائع سے استدلال کے لیے غامدی صاحب کا اصل اصول ان کے شاگرد خاص جناب منظور الحسن صاحب ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''بائیبل تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحف سماوی کا مجموعہ ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ اللہ ہی کی شریعت اور حکمت کا بیان ہے۔ اس کے مختلف حاملین نے اپنے اپنے مذہبی تعصّبات کی بنا پر اگرچہ اس کے بعض اجزا ضائع کر دیے ہیں اور بعض میں تحریف کر دی ہے، تاہم اس کے باوجود اس کے اندر پروردگار کی رشد و ہدایت کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ اس کے مندرجات کو اگر اللہ کی آخری اور محفوظ کتاب قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے تو فلاح انسانی کے لیے اس سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب مقدس میں موسیقی اور آلات موسیقی کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔''

(ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴، ۱۶)

اس اصول کو ہم قارئین کی آسانی کی خاطر مزید تین حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں، کیونکہ غامدی صاحب کے کتاب مقدس سے استدلال کو اگر ہم سامنے رکھیں تو ان کا مذکورہ بالا یہ اصول تین طرح سے ہمارے سامنے آتا ہے:

۱۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں قرآن میں اشارات موجود ہوں، یعنی لفظوں میں رہنمائی موجود نہ ہو تو قرآن میں واردشدہ ان اشارات کو بنیاد بنا کر اسی مسئلے کے بارے میں کتب سماویہ کی تفصیلات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اس

اصول کے تحت غامدی صاحب نے مسئلۂ موسیقی کو ثابت کیا ہے۔

غامدی صاحب کے بقول کتاب مقدس سے موسیقی اور آلات موسیقی کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ زبور کا حوالہ دیتے ہوئے موسیقی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اے خداوند میں تیرے لیے نیا گیت گاؤں گا۔ دس تاروالی بربط پر میں تیری مدح سرائی کروں گا۔''

(ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴، ۱۸)

ایک دوسری جگہ کتاب مقدس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تو ایسا ہوا کہ جب نرسنگے پھونکنے والے اور گانے والے مل گئے تاکہ خداوند کی حمد اور شکر گزاری میں ان سب کی ایک آواز سنائی دے اور جب نرسنگوں اور جھانجھوں اور موسیقی کے سب سازوں کے ساتھ انھوں نے اپنی آواز بلند کر کے خداوند کی ستایش کی کہ وہ بھلا ہے۔'' (ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴، ۱۷)

جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ہیں یا منسوخ نہیں ہیں؟ تو غامدی صاحب یہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن میں موسیقی کے جواز کے بارے میں اشارات موجود ہیں اور قرآن میں موجود یہ اشارات کتاب مقدس کی مذکورہ آیات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ یہ آیات نہ تو منسوخ ہیں اور نہ ہی غیر محفوظ، بلکہ ہمارے لیے شریعت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''...جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں قرآن مجید اصلاً خاموش ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جو موسیقی کی حلت وحرمت کے بارے میں کسی حکم کو بیان کر رہی ہو۔ البتہ، اس میں بعض ایسے اشارات ضرور موجود ہیں جن سے موسیقی کے جواز کی تائید ہوتی ہے۔ ان کی بنا پر قرآن سے موسیقی کے جواز کا یقینی حکم اخذ کرنا تو بلاشبہ کلام کے اصل مدعا سے تجاوز ہوگا۔'' (ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴، ۱۲)

گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں، ان کے بقول، موسیقی کے وارد شدہ اشارات اس بات کی دلیل ہیں کہ موسیقی کے حوالے سے کتاب مقدس کی آیات محفوظ ہیں۔

۲۔ اگر کسی مسئلہ کے بارے میں قرآن میں خبر کے انداز میں لفظوں میں سابقہ شرائع کے حوالے سے کوئی رہنمائی موجود ہو اور یہ الفاظ مجمل ہوں تو ان الفاظ قرآنیہ کی تفصیل کتاب مقدس کی آیات سے کی جا سکتی ہے۔ اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے قرآن میں موجود لفظ 'تماثیل' کی بائیبل کی آیات کی روشنی میں تفصیل کی ہے۔ اور شیر، بیل اور ملائکہ کی تصاویر کو بھی کتاب مقدس کی روشنی میں صحیح قرار دیا ہے۔ ایک جگہ تورات کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سلیمان علیہ السلام کے محل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اوران حاشیوں پر جو پڑوں کے درمیان تھے، شیر اور بیل اور کروبی (فرشتے) بنے ہوئے تھے۔''

(ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۰۰،۳۴)

ایک اور جگہ ہیکل کی تعمیر کے حوالے سے تورات کی آیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اورالہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی (فرشتے) دس دس ہاتھ اونچے بنائے۔''

(ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۰۰،۳۴)

جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ تورات کی ان آیات کے محفوظ ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں حضرت سلیمان کے حوالے سے تماثیل کا ذکر موجود ہے۔ گویا کہ قرآن کے اجمالی الفاظ تورات کی ان تفصیلات کی تائید کر رہے ہیں۔

۳۔قرآن کے مبہمات کی وضاحت کے لیے بھی غامدی صاحب کتاب مقدس سے رہنمائی لیتے ہیں۔ اس اصول کے تحت انھوں نے قرآن میں موجود یاجوج ماجوج سے متعلقہ مبہم الفاظ کی توضیح اقوام مغرب سے کی ہے۔ یاجوج ماجوج سے متعلقہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''...اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یاجوج وماجوج کی اولاد، یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر و فلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے۔''

(ماہنامہ اشراق، جنوری ۱۹۹۶،۶۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں یاجوج وماجوج کا جو ذکر ہے، اس سے مراد مغربی اقوام ہیں۔ لیکن جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یاجوج ماجوج کا جو ذکر کیا ہے اس سے مراد مغربی اقوام ہیں؟ تو جواب میں غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ تورات سے اس بات کی تعیین ہوتی ہے کہ یاجوج ماجوج سے مراد مغربی اقوام ہیں۔ یاجوج ماجوج کا تعین کرتے ہوئے ایک جگہ تورات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش (روس)، مسک (ماسکو) اور توبل (توبالسک) کا فرماں روا ہے، متوجہ ہو اور اس کے خلاف نبوت کر۔''

(ماہنامہ اشراق، اکتوبر ۱۹۹۰،۵)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اپنے اس علاقے سے قدیم زمانوں میں یہی لوگ یورپ میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں سے پھر صدیوں کے بعد تاریخ کی روشنی میں امریکا اور آسٹریلیا پہنچے اور اب دنیا کے سارے پھاٹک انھی کے قبضے میں ہیں۔''

(ماہنامہ اشراق، اکتوبر ۱۹۹۰، ۵)

جب ہم غامدی صاحب سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تورات کی یہ آیات محفوظ ہیں؟ تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں موجود یاجوج ماجوج کا ذکر تورات کی ان آیات کی تصدیق کر رہا ہے۔

غامدی صاحب کے تصور کتاب کی غلطی

قدیم صحائف سے استدلال کا جو اصول غامدی صاحب نے وضع کیا ہے یہ بوجوہ غلط ہے۔تفصیلات ذیل میں مذکور ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ غامدی صاحب کے بقول اشارات قرآنی سے کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق ہوتی ہے۔ٹھیک ہے، اگر ہم کچھ دیر کے لیے غامدی صاحب کی بات مان بھی لیں تو پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا تعین کون کرے گا کہ فلاں مسئلے کے بارے میں قرآن میں اشارات موجود ہیں؟ کیونکہ اشارات ایک ایسی غیر واضح اصطلاح ہے کہ جو چاہے، جب چاہے قرآن سے کوئی بھی مسئلہ 'اشارات' کی شکل میں نکال سکتا ہے۔مثال کے طور پر صوفیا کی تفسیر اشاری دیکھی جا سکتی ہے جس میں انھوں نے 'اشارات' کے نام پر قرآن سے عجیب وغریب قسم کے مسائل نکالے ہیں۔غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں موسیقی کے جواز کے بارے میں اشارات موجود ہیں جبکہ ہمارے نزدیک غامدی صاحب کا یہ کہنا غلط ہے۔قرآن میں مروجہ موسیقی کے جواز کے بارے میں کسی قسم کے اشارات موجود نہیں ہیں۔جس قسم کے اشارات سے غامدی صاحب نے مسئلۂ موسیقی میں استدلال کیا ہے، اس قسم کے اشارات سے تو ہر مسئلہ قرآن سے نکالا جا سکتا ہے۔غامدی صاحب کے بقول قرآن مجید کی آیات کا صوتی آہنگ اور قرآن کی آیت مبارکہ 'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ' میں یہ اشارات موجود ہیں کہ موسیقی جائز ہے۔غامدی صاحب کے اس نادر طرز استدلال پر ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ عقل عام بھی اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ غامدی صاحب کا یہ طرز استدلال کس قدر بودا ہے۔کہاں قرآن کا صوتی آہنگ اور کہاں بینڈ باجے، ڈھول بانسریاں، گٹار اور پیانو وغیرہ جیسے آلات موسیقی! کہاں حضرت داؤد کا خوب صورت آواز میں اللہ کی تسبیح بیان کرنا، جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں ہو رہا ہے اور کہاں کسی عورت کا رقص وسرود کی محفلوں میں محبوب

سے متعلق جذبات کا اظہار کرنا! اگر قرآن کا صوتی آہنگ اور حضرت داؤد کا خوب صورت آواز میں اللہ کی تسبیح بیان کرنا موسیقی ہے تو ہم بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ قرآن میں موسیقی موجود ہے، لیکن قرآن سے جو موسیقی غامدی صاحب ثابت کرنے چلے ہیں یا قرآن کے ان اشارات کی تطبیق میں غامدی صاحب ہمارے معاشروں میں موجود رقص وسرود کی جن محفلوں کی تائید کرنا چاہتے ہیں، ان کی تائید کسی طرح سے بھی ان اشارات قرآنی سے ثابت نہیں ہو رہی۔ ان اشارات قرآنی سے یہ بھی ثابت نہیں ہو رہا کہ حضرت داؤد کے پاس 'دس تاروں والی بربط' تھی جس پر وہ اللہ کی حمد وثنا کیا کرتے تھے۔ قرآن نے تو صرف حمد وثنا کا تذکرہ کیا ہے، دس تاروں والی بربط کا بیان صرف کتاب مقدس کا ہے جس کے بارے میں ہمارے علم میں نہیں ہے کہ یہ بیان محفوظ ہے یا نہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ غامدی صاحب نے قرآن میں وارد شدہ لفظ 'تماثیل' کو بنیاد بنا کر کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق کی ہے۔ حالانکہ قرآن نے تو صرف اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اللہ کے حکم سے جنات ان کے لیے 'تماثیل' بنایا کرتے تھے۔ اب یہ 'تماثیل' کیا تھیں؟ اس کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ قرآن نے تماثیل کی تصدیق کی ہے نہ کہ شیر، بیلوں اور فرشتوں کی تصاویر کی۔ قرآن کے الفاظ میں اجمال ہے اور قرآن کتاب مقدس کی اس حد تک تو تصدیق کر رہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں تماثیل تھیں، لیکن قرآن قطعاً ان تفصیلات کی تصدیق نہیں کر رہا جو کہ کتاب مقدس میں موجود ہیں۔ اس لیے قرآن کے اجمالی بیان سے کتاب مقدس کے اجمال کی تو تصدیق ہوتی ہے، لیکن قرآن کے مجمل الفاظ کتاب مقدس کی تفصیلی آیات کی تصدیق نہیں کر رہے، اس لیے قرآن سے یہ بالکل بھی واضح نہیں ہوتا کہ کتاب مقدس کا یہ تفصیلی بیان محفوظ ہے یا اس میں بھی کمی بیشی ہو چکی ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ قرآن کے اجمال سے کتاب مقدس کا اجمال اور قرآن کی تفصیل سے کتاب مقدس کی تفصیل محفوظ ثابت ہوتی ہے، لیکن قرآن کے اجمال سے کتاب مقدس کے تفصیلی بیان کو محفوظ ثابت کرنا عقل ونقل کے خلاف ہے۔ قرآن میں وارد شدہ لفظ 'تماثیل' کسی طرح بھی کتاب مقدس کے لفظ 'کروبی' کی تصدیق نہیں کر رہا کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں جنات فرشتوں کی بھی تصاویر بناتے تھے۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ قرآن میں یاجوج ماجوج کا ذکر ہے، لیکن قرآن نے اس بات کو واضح نہیں کیا کہ یاجوج ماجوج سے کیا مراد ہے یا یہ کون لوگ ہوں گے۔ لیکن کتاب مقدس نے یاجوج ماجوج کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان کا تعین بھی کیا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قرآن سے تو صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ کتاب مقدس میں جو یاجوج ماجوج کا تذکرہ ہے وہ صحیح ہے، لیکن قرآن ہرگز بھی کتاب مقدس کی ان آیات کی تصدیق نہیں کر رہا جو کہ یاجوج

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ماجوج کی تعیین کر رہی ہیں۔اس لیے ہمارے لیے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ہیں یانہیں یا یہ آیات کلام الٰہی ہیں یانہیں۔ بہرحال قرآن کسی طور بھی کتاب مقدس کی ان آیات کی تصدیق نہیں کر رہا جو کہ یاجوج ماجوج کی تعیین کے بارے میں ہیں۔

۴۔ چوتھی بات یہ کہ غامدی صاحب کتاب مقدس سے استدلال کا اپنا شوق ضرور پورا کریں،لیکن ہم ان سے اتنی گزارش کرتے ہیں کہ پہلے کتاب مقدس کی ان آیات کو محفوظ تو ثابت کریں جن سے آپ استدلال کر رہے ہیں۔ چند موہوم اشارات قرآنیہ کو بنیاد بنا کر کتاب مقدس کی آیات کو محفوظ ثابت کرنا اور ان سے کسی شرعی مسئلے میں استدلال کرنا کسی محقق کے شایان شان نہیں ہے۔غامدی صاحب کے بقول:

''...پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔بیش تر مقامات پر اللہ کی حمد وثنا کے لیے موسیقی کے استعمال کا ذکر آیا ہے۔''(ماہنامہ اشراق،مارچ ۲۰۰۴، ۱۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لیکن ہم غامدی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اس بات کی دلیل کیا ہے؟اور وہ جواب میں دلیل کے طور پر کتاب مقدس کی آیات پیش کر دیتے ہیں۔ جب ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ہیں؟ تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن سے کتاب مقدس کی ان آیات کی تائید ہو رہی ہے۔حالانکہ ان کا یہ دعویٰ صریحاً باطل ہے۔قرآن کسی طرح بھی کتاب مقدس میں موجود نرسنگوں، جھانجھوں اور موسیقی کے تمام سازوں کی تائید نہیں کر رہا، جیسا کہ ہم اوپر یہ بات ثابت کر چکے ہیں۔ جب قرآن کتاب مقدس کی ان آیات کی تائید نہیں کر رہا تو کتاب مقدس کی یہ آیات بھی محفوظ ثابت نہیں ہوئیں۔ جب کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ثابت نہیں ہوئیں تو یہ بھی ثابت نہ ہوا کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی جائز رہی ہے،لہٰذا غامدی صاحب کا دعویٰ باطل ہوا۔

اس اصول پر شرعی دلائل کی روشنی میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے ہم تمہیداً غامدی صاحب کی خدمت میں ان کے امام اور خود ان کی اپنی تحریروں کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کر رہے ہیں۔

غامدی صاحب کا اصول مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی نظر میں

سجدۂ تعظیمی سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تحریر میں سے چند اقتباسات ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

''...سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں یا بعض جگہ پچھلی شریعتوں کے جو حوالے آ گئے ہیں، کیا وہ مجرد اتنی بات سے کہ وہ قرآن میں مذکور ہوئے ہیں'اس امت کے لیے شریعت کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں' یا

اس امت کے لیے ان کے شریعت بننے کے لیے کچھ اور شرطیں بھی ہیں۔ میرا نقطۂ نظر اس طرح کے تمام واقعات اور حوالوں سے متعلق یہ ہے کہ یہ مجرد قرآن میں مذکور ہو جانے کی وجہ سے امت محمدیہ کے لیے شریعت نہیں بن سکتے... قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کو ان کے بھائی نے قتل کر دینے کی دھمکی دی تو انھوں نے کہا کہ میں تو تم پر قتل کے ارادے سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، خواہ تم مجھے قتل ہی کر ڈالو، میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محض اس خدمت کے معاوضے میں کر دیا کہ وہ ایک خاص مدت تک ان کی بکریاں چرائیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ ان کی قوم کے غنڈوں نے جب ان کے مہمانوں کی فضیحت کرنی چاہی تو انھوں نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر تمھیں کچھ کرنا ہی ہے تو میری لڑکیوں کے ساتھ کرو، خدارا میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ایک مرتبہ فوج کی پریڈ کے موقع پر ان کی نماز عصر قضا ہو گئی تو انھوں نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر گھوڑوں ہی کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ سورۂ کہف میں ایک نیک بندے کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اس بنا پر ایک بچے کو قتل کر دیا کہ انھیں یہ علم ہو گیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کا نافرمان ہو گا، اور ایک کشتی میں اس بنا پر سوراخ کر دیا کہ انھیں اندیشہ ہوا کہ اس دیار کا بادشاہ کہیں اس کشتی کو قبضے میں نہ کر لے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے واقعات ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور بطریق مذمت نہیں بیان ہوئے، بلکہ بطریق مدح بیان ہوئے ہیں۔ اب بتائیے کہ کیا مجرد اس بنا پر کہ یہ واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں، یہ اس امت کے لیے قانون اور شریعت بن جائیں گے؟ اور ایک شخص کے لیے یہ بات جائز ہو جائے گی کہ اگر وہ اپنے کشفی علم سے کسی بچے کے بارے میں یہ معلوم کرے کہ یہ نافرمان اٹھے گا تو اسے قتل کر ڈالے یا اس کی کوئی چیز اس کے لیے فتنہ کا سبب بن جائے تو اس کو تباہ کر ڈالے یا کوئی شخص اس پر حملہ آور ہو تو اپنے آپ کو بے چون و چرا اس کے حوالے کر دے؟... ان ضمنی طور پر بیان شدہ واقعات سے اگر کوئی تعلیم نکلتی ہے تو وہ اس امت کے لیے اسی صورت میں ہدایت اور شریعت کا درجہ حاصل کر سکتی ہے، جب کتاب و سنت کی دوسری تصریحات سے بھی اس بات کی تائید ہو جائے کہ اس تعلیم کو اس امت کے اندر بھی باقی رکھنا شارع کو مطلوب ہے، یا کم از کم یہ کہ کوئی بات اس کے خلاف نہ پائی جائے۔ لیکن اگر دوسری تصریحات اس کے خلاف ہوں تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ اس امت میں اس تعلیم کو باقی رکھنا شارع کو مطلوب نہیں ہے۔

اگر اس قسم کی کوئی تصریح خود قرآن میں ہو تو وہ تصریح اس اشارہ پر مقدم ہو جائے گی... اور اگر یہ تصریح قرآن کے بجائے حدیث میں ہو تو بھی اس کو تقدم حاصل ہو گا... جو کچھ موجود ہے اس کی حیثیت محض ایک واقعہ کی ہے جو

پچھلی امتوں میں سے کسی امت میں یا سابق انبیا میں سے کسی نبی کی زندگی میں پیش آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس امت میں یہ بات بعینہٖ اس شکل میں مطلوب ہے یا نہیں تو اس کی وضاحت قرآن بھی کر سکتا ہے اور حدیث بھی کر سکتی ہے۔ قرآن کے کسی واضح حکم کو منسوخ کر دینے کے لیے تو بلا شبہ حدیث ناکافی ہے، لیکن پچھلی امتوں یا سابق انبیا میں سے کسی کی تعلیم کو یا کسی روایت کو منسوخ کر دینے کے لیے تو حدیث بالکل کافی ہے۔ بے شمار معاملات ایسے ہیں جن میں ہم جانتے ہیں کہ سابق انبیا کی تعلیم کچھ اور تھی اور ہمارے نبی کریم نے ہمیں اس کی جگہ کوئی اور ہدایت فرمائی اور ہم بے چون و چرا اس کو تسلیم کرتے ہیں، یہ عذر نہیں پیش کرتے کہ کسی سابق نبی کی تعلیم کو حدیث کس طرح منسوخ کر سکتی ہے۔'' (ماہنامہ اشراق، نومبر ۱۹۸۹، ۳۶-۳۸)

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی درج بالا عبارت سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ کتاب مقدس کی وہ تعلیمات جو قرآن میں اشارتاً، اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئی ہیں، اس وقت تک ہمارے لیے دلیل نہیں بن سکتیں جب تک کہ خود قرآن یا حدیث سے ان تعلیمات کا اثبات نہ ہو۔ گویا کہ اصل دلیل قرآن و سنت ہے نہ کہ سابقہ شرائع، جبکہ غامدی صاحب سابقہ شرائع کو مستقل طور پر مآخذ دین میں سے شمار کرتے ہیں اور ان سے بھی مسائل کا اثبات کرتے ہیں۔

۲۔ قرآن کے علاوہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی کتب سابقہ کی تعلیمات کی منسوخی کے لیے کافی ہیں۔ یعنی قرآن کی کسی آیت کی تفسیر یا اس کے علاوہ کسی مسئلے میں اگر کتاب مقدس اور احادیث میں اختلاف ہو جائے تو حجت احادیث ہوں گی۔ جبکہ غامدی صاحب قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں احادیث کے بالمقابل کتاب مقدس کی آیات کو ترجیح دیتے ہیں، جیسا کہ بہت سارے معاملات میں ان کی آرا سے بھی ظاہر ہے۔

۳۔ بہت سارے احکامات جو پچھلی شریعتوں میں جائز تھے، ہمارے لیے ان پر عمل کرنا یا ان سے اپنے عمل پر دلیل پکڑنا جائز نہیں۔ جبکہ غامدی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں کہ ایک فعل کسی شریعت میں جائز رہا ہو اور بعد میں اسے کسی دوسری شریعت میں شارع کی طرف سے ناجائز قرار دے دیا گیا ہو۔

غامدی صاحب کا اصول ''میزان'' کی نظر میں

غامدی صاحب نے جس طرح سے موسیقی، یاجوج ماجوج اور تصویر وغیرہ کے مسئلے میں کتاب مقدس سے استدلال کیا ہے، وہ خود ان کے اپنے اس اصول کے خلاف ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کیا ہے۔ غامدی صاحب ''میزان'' میں ایک جگہ تدبر قرآن کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''سوم یہ کہ الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیاے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی، ۵۲)

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک قدیم صحائف کو یہود و نصاریٰ کے اخبار و واقعات اور قصص و تاریخ سے متعلقہ قرآنی آیات کو سمجھنے کے لیے ماٰخذ بنایا جائے گا نہ کہ احکام و عقائد کے لیے۔ یہ نہایت موزوں موقع تھا کہ غامدی صاحب اس مسئلے پر اصولی بحث کرتے ہوئے اپنی اس عبارت میں احکام اور عقائد کا بھی تذکرہ کر دیتے، لیکن ان کا یہاں پر احکام و عقائد کا تذکرہ نہ کرنا اور کہیں اور جا کر احکام اور عقائد سے متعلقہ مسائل کے لیے قدیم صحائف کو بنیاد بنانا ذہن میں کچھ سوالات ضرور پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ موسیقی اور تصویر کا تعلق احکام سے ہے اور یاجوج ماجوج کا تعین عقیدے کا مسئلہ ہے۔ عقیدے اور احکام کے بارے میں غامدی صاحب کے ہاں ایک انتہا تو یہ ہے کہ خبر واحد سے تو کسی بھی حکم اور عقیدے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، لیکن دوسری طرف تحریف شدہ کتاب مقدس سے وہ کس سہولت و آسانی سے احکام و عقائد کا اثبات کر رہے ہیں، یہ بالکل ظاہر و باہر ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک حدیث سے کوئی نیا حکم یا عقیدہ تو ثابت نہیں ہو سکتا، اگرچہ وہ حدیث قرآن میں موجود کسی حکم یا عقیدے کی تفہیم و تبیین میں دلیل بن سکتی ہے جبکہ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ غامدی صاحب کتاب مقدس سے ایک نئے حکم (موسیقی کا جواز) کو ثابت کر رہے ہیں، کیونکہ بقول ان کے قرآن کے الفاظ میں اس مسئلہ کی حلت و حرمت کے بارے میں کوئی یقینی حکم نہیں ہے۔ گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک کتاب مقدس صرف قرآنی آیات و احکام کی تفہیم و تبیین ہی نہیں کرتی، بلکہ اس سے نئے احکام کا اثبات بھی کیا جا سکتا ہے۔

غامدی صاحب کا اصول دلائل شرعیہ کی روشنی میں

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد امت محمدیہ نہ تو سابقہ شرائع کی متعبد ہے اور نہ ہی سابقہ امم کی کتابیں ہمارے لیے ماٰخذ دین کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہمارے اس دعوے کے درج ذیل دلائل ہیں:

پہلی دلیل

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا:

کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال: ''''اگر تمھیں کوئی مسئلہ درپیش ہوگا تو کیسے فیصلہ کرو

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اقـضـی بکتاب اللّٰه، قال: فان لم تجد فی کتاب اللّٰه، قال: فبسنة رسول اللّٰه، قـال: فـان لم تجد فی سنة رسول اللّٰه و لا فی کتاب اللّٰه، قال: اجتهد رأیی. (سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، باب اجتہاد الرأی فی القضاء)

گے؟'' تو حضرت معاذ نے جواب دیا: میں قرآن سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تمھیں قرآن میں نہ ملے؟'' تو حضرت معاذ نے کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر وہ مسئلہ نہ قرآن میں ملے اور نہ سنت رسول میں؟'' تو حضرت معاذ نے جواب دیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔''

اس روایت میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پچھلے انبیا اور ان کی تعلیمات کا بالکل بھی تذکرہ نہیں کیا۔ اگر سابقہ کتب سماویہ بھی مآخذ دین میں سے ہوتیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ان کتب کی طرف بھی رجوع کا حکم دیتے۔ لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس قول کو صحیح قرار دیتے ہوئے ان کے لیے دعا کی۔ واضح رہے کہ اس روایت کی صحت وضعف کے بارے میں اگرچہ محدثین کا اختلاف ہے، لیکن اس کی تائید بہت سے شواہد و آثار سے بھی ہوتی ہے جس سے یہ روایت حسن کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔

دوسری دلیل

قاضی شریح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کو ایک خط لکھا جس میں قضا کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رہنمائی حاصل چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو جواباً یہ خط لکھا:

ان اقـض بـمـا فـی کتاب اللّٰه، فان لم یـکن فی کتاب اللّٰه فبسنة رسول اللّٰه، فان لم یکن فی کتاب اللّٰه و لا فی سنة رسـول الـلّٰـه فـاقـض بـمـا قضی بـه الـصـالـحـون، فان لم یکن فی کتاب الـلّٰه و لا فی سنة رسول اللّٰه ولم یقض بـه الـصـالـحون فان شئت فتقدم و ان شـئـت فتـاخـر و لا اری التـاخـر الا خیرلك و السلام علیکم.

''تم اللہ کی کتاب قرآن کے ساتھ (لوگوں کے درمیان) فیصلہ کرو، اگر کتاب اللہ میں وہ مسئلہ موجود نہ ہو تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ فیصلہ کرو، اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں بھی نہ ہو اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نہ ہو تو نیک لوگوں کے فیصلوں کو سامنے رکھو، پس اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں بھی نہ ہو اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نہ ہو اور نیک لوگوں نے بھی اس کے بارے میں کوئی رائے نہ دی ہو تو اب اگر تم چاہو تو آگے بڑھو (یعنی خود

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

(سنن نسائی، کتاب آداب القضاۃ، باب الحکم باتفاق اھل العلم)

اجتہاد کرو) اور اگر تم چاہو تو رکے رہو (یعنی اپنے اجتہاد سے فیصلہ نہ کرو) لیکن میرے خیال میں تمھارا رکا رہنا تمھارے حق میں بہتر ہے اور تمھارے اوپر اللہ کی سلامتی ہو۔''

یہ روایت صحیح ہے۔ علامہ البانی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

تیسری دلیل

اگر پچھلی شریعتیں بھی مآخذ دین میں سے ہوتیں تو ان کا سیکھنا فرض کفایہ ہوتا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تورات وانجیل کی تعلیم حاصل کرتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی کتاب مقدس کی تعلیم دیتے۔ جبکہ ہمارے علم میں ہے کہ نہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سابقہ کتب کا مطالعہ کیا اور نہ صحابہ نے ان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی، حالانکہ آپ اور صحابہ کے پاس عبداللہ بن سلام، کعب الاحبار اور وھب بن منبہ رضی اللہ عنہم کی صورت میں اس کے مواقع بھی موجود تھے۔

چوتھی دلیل

اس بات پر علماے امت کا اجماع ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا[1]۔ اگر استثنا ہے بھی تو محض عقائد، اخلاقیات اور چند بنیادی مخصوص احکامات کا جن کو ہماری شریعت نے بھی برقرار رکھا ہے۔ اس لیے پچھلی شریعتوں سے عمومی طور پر دلیل پکڑنا صحیح نہیں ہے۔

پانچویں دلیل

حضرت جابر سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اعطیت خمسا لم یعطھن احد قبلی: نصرت بالرعب مسیرۃ شھر و جعلت لی الارض مسجدا وطھورا فایما رجل من امتی ادرکتہ الصلاۃ فلیصل واحلت لی الغنائم ولم تحل لاحد قبلی واعطیت الشفاعۃ و کان النبی

''مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں کہ مجھ سے پہلے وہ کسی (نبی) کو نہ دی گئیں، پہلی بات یہ ہے کہ ایک مہینے کی مسافت تک دشمنوں پر میرا رعب ڈال دیا گیا۔ دوسری بات یہ کہ تمام زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک بنا دیا گیا۔ پس اگر میری امت میں کوئی بھی نماز (کا وقت کہیں بھی) پالے تو وہ (اسی جگہ) نماز ادا

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام، علامہ آمدی ۴/۱۹۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یبعث الی قومہ خاصۃ و بعثت الی الناس عامۃ.
(صحیح البخاری، کتاب التیمم، باب قول اللہ تعالیٰ، فلم تجدوا ماءً فتیمموا)

کر لے۔ تیسری بات یہ کہ میرے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا۔ چوتھی بات یہ کہ مجھے مقام شفاعت عطا کیا گیا اور پانچویں بات یہ کہ مجھ سے پہلے انبیا کو ایک خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام نوع انسانی کا نبی بنا کر بھیجا گیا۔''

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ 'وکان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ' اس مسئلے میں قطعی حجت ہیں کہ سابقہ شرائع مخصوص اقوام کے لیے تھیں جبکہ 'وبعثت الی الناس عامۃ' کے الفاظ سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ آپ کی ہی شریعت وہ اکیلی شریعت ہے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے رہنمائی اور ہدایت کی صلاحیت رکھتی ہے۔

چھٹی دلیل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

کان اھل الکتاب یقرء ون التوراۃ بالعبرانیۃ ویفسرونھا بالعربیۃ لاھل الاسلام فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: 'لا تصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوھم وقولوا امنا باللّٰہ وما انزل الینا...الآیۃ'.
(صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا)

''اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے عربی زبان میں اس کی تفسیر کرتے تھے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'نہ تو اہل کتاب کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو اور یہ بات کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا'...۔''

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو وحی آتی تھی اور آپ وحی کی روشنی میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتا سکتے تھے کہ تورات کی یہ آیات محفوظ ہیں یا نہیں اور تورات کی محفوظ آیات سے استدلال بھی کر سکتے تھے، لیکن آپ نے نہ تو بذات خود تورات کی آیات کی تصدیق کی اور نہ ہی صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی اجازت دی، چہ جائیکہ آپ اس سے کسی مسئلے میں استدلال کرتے۔

ساتویں دلیل

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بلغوا عنی ولو آیة وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار.
(سنن ترمذی، کتاب العلم عن رسول اللہ، باب ماجاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل)

''میری طرف سے پہنچاؤ چاہے وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہواور بنی اسرائیل سے روایت کرلیا کرو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے،اور جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''

'ولا حرج' کے الفاظ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل سے روایت کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ مباح ہے۔ ایک ایسی چیز کہ جس سے نقل کرنے کی رخصت دی گئی ہو وہ ہمارے لیے شریعت کیسے ہوسکتی ہے؟ جو چیز شریعت ہے، اس سے استدلال واجب ہے جیسے کہ قرآن وسنت ہیں۔ جبکہ سابقہ کتب سے رہنمائی کو واجب قرار نہیں دیا گیا، بلکہ اس کی رخصت دی گئی ہے اور یہ رخصت بھی راجح قول کے مطابق صرف واقعات کی حد تک ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دینے کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی جاری فرما دی کہ اہل کتاب کی باتیں سن لینے میں اور بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ان کی باتوں کی تصدیق یا تکذیب نہ کرو۔ اس حدیث کے مطابق بنی اسرائیل سے متعلقہ قرآنی اخبار وقصص کی تکمیل کے لیے کتاب مقدس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ان واقعات میں بھی بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے نقل کرنے کی اجازت تو دے دی، لیکن اس کی تصدیق وتکذیب سے روک دیا۔

آٹھویں دلیل

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

کیف تسالون اهل الکتاب عن شیء وکتابکم الذی انزل علی رسول اللّٰه احدث تقرؤونه محضا لم یشب وقد حدثکم ان اهل الکتاب بدلوا کتاب اللّٰه وغیره وکتبوا بایدیهم الکتاب وقالوا هو من عند اللّٰه لیشتروا به ثمنا قلیلا الا ینهاکم ما جاء کم من العلم عن مسألتهم لا واللّٰه ما راینا منهم

''کیسے تم اہل کتاب سے کسی مسئلے کے بارے میں پوچھتے ہو حالانکہ تمھاری کتاب جو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، زیادہ نئی ہے؟ تم اس کو خالص حالت میں پڑھتے ہو اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کی گئی۔ جبکہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا ہے اور اس کو تبدیل کر دیا ہے اور اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھی ہے اور اس کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ وہ اس کے بدلے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رجلا يسألكم عن الذی انزل علیکم. (صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول النبی لاتسالوا اھل الکتاب عن شیء)

میں کچھ قیمت حاصل کرسکیں۔ خبردار! جو علم (قرآن و سنت) تمھارے پاس آیا ہے، وہ تمھیں اہل کتاب سے سوال کرنے سے منع کرتا ہے۔ نہیں، اللہ کی قسم ہم نے اہل کتاب میں سے کسی آدمی کو نہیں دیکھا کہ جو تم سے اس (قرآن و سنت) کے بارے میں سوال کرے جو کہ تم پر نازل کیا گیا ہے۔''

اگر کوئی اس حدیث کی تشریح میں یہ بات کہے کہ اہل کتاب سے کوئی مسئلہ دریافت کرنے سے منع کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ سابقہ کتب محفوظ نہیں، اگر وہ محفوظ ثابت ہو جائیں تو ان سے رہنمائی لی جا سکتی ہے، تو ہمارے نزدیک یہ استدلال غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے سابقہ کتب کی تعلیمات کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ وہ محفوظ ہیں یا نہیں، چنداں مشکل نہ تھا۔ صحابۂ کرام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ سکتے تھے جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ تعلیم محفوظ ہے اور اس میں تحریف ہو چکی ہے۔ لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور آپ کا سابقہ کتب کی تعلیمات سے عدم تعرض اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سابقہ کتب سے استدلال نہ کرنے کا جو حکم ہے، اس کی اصل علت شریعت محمدیہ کا کامل و اکمل ہونا ہے جو کہ انتہائی درجے اتمام اور اکمال کی وجہ سے سابقہ شرائع کی کسی طور بھی محتاج نہیں ہے۔

نویں دلیل

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تسألوا اھل الکتاب عن شیء فانھم لن یھدوکم وقد ضلوا فانکم اما ان تصدقوا بباطل او تکذبوا بحق ولو کان موسیٰ حیا بین اظھرکم ما حل له الا ان یتبعنی. (مسند احمد، رقم ۱۴۱۰۴)

''اہل کتاب سے کچھ بھی نہ پوچھو۔ بے شک وہ تمھاری رہنمائی نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ خود گمراہ ہو چکے ہیں۔ ان سے مسئلہ پوچھ کر یا تو تم کسی باطل چیز کی تصدیق کر بیٹھو گے یا کسی حق بات کو جھٹلاؤ گے۔ (یاد رکھو) اگر موسیٰ (علیہ السلام) بھی تمھارے درمیان موجود ہوتے تو ان کے لیے بھی سوائے میری اتباع کے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔''

اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جب نفی یا نہی کے سیاق میں نکرہ آئے تو نص میں عموم پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا 'عن شیء' میں

ہر چیز داخل ہے۔ یعنی سابقہ شرائع کسی مسئلے میں بھی رہنمائی کے قابل نہیں ہیں، چاہے وہ مسئلہ عقائد سے متعلق ہو یا احکام سے یا اخبار وقصص سے۔ کسی حد تک قرآن وسنت کے سیاق وسباق کی تعیین کے لیے اسرائیلی اخبار وقصص کے نقل کرنے کی جو رخصت دی گئی ہے، اس میں بھی اصل مطلوب ان کتب میں بیان شدہ واقعات سے رہنمائی حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل مقصد قرآن وسنت میں وارد شدہ واقعات کے صحیح مفہوم تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

دسویں دلیل

آج یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے زمانے میں صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے نہ کہ اس وقت کی پوری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں مصر وفلسطین کے علاوہ بھی دنیا تھی جہاں لوگ آباد تھے۔ ان کے لیے شریعت کون سی تھی؟ ان کی طرف کس نبی کو بھیجا گیا تھا؟ کیا حضرت موسیٰ اپنے وقت میں ساری دنیا کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے؟ یقیناً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور تاریخ اس چیز کی نفی کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری دنیا کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اپنے زمانے میں موجود تمام انسانوں کے لیے حجت نہ تھی تو صدیوں بعد آنے والی امت محمدیہ کے لیے کیسے دلیل بن سکتی ہے؟

گیارہویں دلیل

ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

وعن جابر عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم حین اتاہ عمر فقال انا نسمع احادیث من یہود تعجبنا افتری ان نکتب بعضھا؟ فقال امتھوکون انتم کما تھوکت الیھود والنصاری؟ قد جئتکم بھا بیضاء نقیۃ ولو کان موسیٰ حیا ما وسعہ الا اتباعی.
(المشکوٰۃ، رقم ۱۹۴)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے تو انھوں نے آپ سے کہا کہ ہم یہود سے بہت ساری ایسی باتیں سنتے ہیں جو کہ ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے، اگر ہم ان میں سے بعض باتوں کو لکھ لیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم بھی اہل یہود کی طرح ہلاک ہونا چاہتے ہو! میں تمھارے پاس ایسی واضح اور روشن آیات لے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کر آیا ہوں کہ اگر حضرت موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔''

علامہ البانی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔

ایک اور طویل روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ولو کان حیا وادرك نبوتی لا تبعنی. (المشکوٰۃ، رقم ۱۷۷)

''اور اگر حضرت موسیٰ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پا لیتے تو لازماً میری اتباع کرتے۔''

بعض روایات میں الفاظ ہیں:

لو کان موسیٰ وعیسیٰ حیین لما وسعهما الا اتباعی.

(تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، آل عمران ۳:۸۱)

''اگر موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔''

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پچھلی ساری شریعتیں منسوخ ہیں۔ اور اگر وہ محفوظ ثابت ہو بھی جائیں تو پھر بھی ان پر عمل نہ ہوگا، جیسا کہ غامدی صاحب کا اصول ہے کہ کتاب مقدس کی آیات کو پہلے محفوظ ثابت کرتے ہیں اور پھر ان سے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ صاحب تورات (حضرت موسیٰ) اور صاحب انجیل (حضرت عیسیٰ) کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ بھی زندہ ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کی اتباع کرتے، اور تورات اور انجیل کو حضرات موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے زیادہ کون جانتا ہوگا؟ جب ان انبیا کے بارے میں فرما دیا گیا جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں کہ وہ بھی اگر آپ کے زمانے کو پا لیں تو انھیں بھی اپنی کتابوں کی بجائے آپ کی اتباع کرنی ہوگی، حالانکہ اس صورت حال میں تو تورات وانجیل بعینہٖ اپنی اصل شکل میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ حضرات موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اگر زندہ ہوتے تو ان کے لیے تورات وانجیل ایسے ہی محفوظ ہوتیں جیسے ہمارے لیے قرآن، کیونکہ ان سے زیادہ تورات وانجیل کو کون جانتا ہوگا، لیکن اس کے باوجود ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ آپ کے ایک امتی ہی کی حیثیت سے اس امت میں زندگی گزارتے۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ جب اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو آپ کے امتی ہی کی حیثیت سے آئیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی لائی گئی شریعت کے پیرو ہوں گے نہ کہ تورات وانجیل کے۔ مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

وعن جابر قال قال رسول اللّٰه صلی

''اور حضرت جابر سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

الله علیه و سلم لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة، قال فینزل عیسیٰ بن مریم فیقول امیرهم تعال صل لنا فیقول لا ان بعضکم علیٰ بعض امراء تکرمة الله هذه الامة. (المشکوٰۃ، رقم ۵۵۰۷)

وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق کے لیے لڑتا رہے گا اور (اپنے دشمنوں پر) قیامت (کے قریب) تک غالب رہے گا، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم کا نزول ہو۔ تو ان کا امیر حضرت عیسیٰ سے کہے گا: آئیں ہمارے لیے امامت کرائیں تو حضرت عیسیٰ انکار کریں گے اور فرمائیں گے کہ تم میں بعض، بعض کا امیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عزت بخشی ہے (کہ ان کا امیر انھی میں سے ہو)۔''

علامہ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

بارھویں دلیل

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں آیۂ مبارکہ 'وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ' (آل عمران ۳:۸۱) کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان فقہاے صحابہ کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انبیا سے یہ وعدہ لیا تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کی زندگی میں آپ مبعوث ہو جائیں تو وہ آپ پر لازماً ایمان لے آئیں گے اور آپ کی مدد کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ اپنی امت سے بھی یہ پختہ وعدہ لیں کہ اگر ان کی موجودگی میں آپ کا ظہور ہو جائے تو وہ آپ پر ایمان لے آئیں گے۔''

انبیا سے آپ پر ایمان لانے کا جو مطالبہ کیا گیا ہے، اس سے یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو رہی ہے کہ آپ کی آمد کے بعد کسی نبی کو بھی اپنی شریعت پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، چہ جائیکہ کسی امتی کو آپ کی بعثت کے بعد یہ اجازت دی جائے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ آخری نبی کی لائی ہوئی شریعت کو اتنا جامع اور مکمل ہونا تھا کہ وہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے رہنمائی بن سکے جبکہ باقی انبیا کو ان کے خاص دور، علاقے اور قوم کی مناسبت سے شریعتیں دی گئی تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کا کتاب مقدس سے ثابت شدہ

عقائد واحکامات کا انکار اور اپنے اصولوں سے انحراف

جیسا کہ ہم نے شروع میں واضح کیا تھا کہ ہمارے نزدیک غامدی صاحب کے اصول بھی غلط ہیں اور ان سے ان اصولوں کے اطلاق میں بھی غلطی ہوئی ہے۔ یہاں ہم ان کے اصول کے اطلاق کی غلطی واضح کریں گے اور ان مسائل کا تذکرہ کریں گے جو ہماری شریعت میں بھی ثابت ہیں اور پچھلی شریعتوں میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن غامدی صاحب یا تو ان کو ماننے میں متامل ہیں یا انکاری ہیں اور اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ قرآن میں ان کا ذکر واضح طور پر نہیں ملتا۔ ان مثالوں کے بیان کرنے سے یہ مقصود ہے کہ محترم جناب غامدی صاحب کتاب مقدس کو دلیل صرف ان مسائل میں بناتے ہیں جو ان کے متجددانہ نظریات کے موافق ہوں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حضرت مسیح کی آمد ثانی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کا تذکرہ قرآن میں بھی موجود ہے اور اس کے علاوہ ہمیں بکثرت آپ کی احادیث مبارکہ میں ملتا ہے اور امت کا اس مسئلے پر اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کی حیثیت سے واپس آئیں گے۔ دوسری طرف کتاب مقدس بھی اس بات کی تائید کرتی نظر آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے۔ لیکن غامدی صاحب اس عقیدے کو ماننے میں اس لیے متامل ہیں کہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کا قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی سے متعلقہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کے بارے میں نہ صرف یہ کہ قرآن مجید بالکل خاموش ہے، بلکہ اس سے جو قرائن سامنے آتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کے بارے میں کچھ سوالات ضرور ذہن میں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرآن مجید نے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے اٹھا لیے جانے کا ذکر کیا ہے، وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کے قیامت تک یہود پر غلبے کی پیشین گوئی بھی کی ہے۔ یہ نہایت موزوں موقع تھا کہ آپ کی آمد ثانی کا ذکر کر دیا جاتا اور اس غلبے کی پیشین گوئی بھی کر دی جاتی جس کا ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کے حوالے سے روایات میں ہوا ہے... پھر حدیث کی سب سے پہلے مرتب ہونے والی کتاب،

''موطا امام مالک'' میں حضرت مسیح کی آمد ثانی سے متعلق کوئی روایت موجود نہیں۔ یہ چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد اتنا اہم مسئلہ ہے کہ امام مالک کا اس سے عدم تعرض سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک روایت میں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب بیان ہوا ہے جس میں آپ نے حضرت مسیح کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ ہمیں خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہی مضمون بڑھتے بڑھتے حضرت مسیح کی آمد ثانی میں تو نہیں بدل گیا؟

یہ قرائن اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی سے متعلق احادیث کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے اور بطور خاص قرآن کے محولہ بالا مقامات سے سامنے آنے والے عقدے کو حل کیا جائے۔ جب تک ان سوالات کا قابل اطمینان جواب نہیں ملتا، اس باب میں کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں۔''

(ماہنامہ اشراق، جنوری ۱۹۹۶، ۶۰-۶۱)

آج جس عقیدے کی صرف امت مسلمہ ہی نہیں، بلکہ پوری عیسائی دنیا بھی قائل ہے، غامدی صاحب ابھی تک اس میں سوچ و بچار کر رہے ہیں۔ یہ غامدی صاحب کی دس سال پہلے کی تحریر ہے۔ میرے خیال میں اب تک تو ان کی طرف سے ہاں یا نہیں میں کوئی واضح موقف سامنے آ جانا چاہیے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن میں حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کے بارے میں کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے تو یہ بات بالکل غلط ہے۔ قرآن میں واضح طور پر حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کا تذکرہ موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا. بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا. (النساء ۴: ۱۵۷-۱۵۹)

''اور ان یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا، حالانکہ انھوں نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی چڑھایا، لیکن معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کیا وہ بھی البتہ اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس اس معاملے کا کوئی علم نہیں ہے سوائے گمان کی پیروی کے، اور انھوں نے حضرت عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ غالب ہے، حکمت والا ہے۔ اور اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ رہے گا جو حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے ان پر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہی
دیں گے۔‘‘

ترجمان القرآن حضرت ابن عباس، امام المفسرین علامہ ابن جریر طبری، امام المتکلمین امام رازی، امام فقہاے مفسرین علامہ قرطبی اور امام اللغہ علامہ زمخشری کے نزدیک اس آیت میں ’بہ‘ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جبکہ ’موتہ‘ کی ضمیر کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے یا ’کتابی‘ کی طرف، بہرحال یہ اختلاف تنوع کا اختلاف ہے۔’موتہ‘ کی ضمیر جس طرف بھی لوٹائی جائے، اس آیت سے حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کے بارے میں پتا چلتا ہے۔قرآن اللہ کے رسول پر نازل ہوا اور قرآن فعل مضارع میں لام تاکید با نون ثقیلہ کے ساتھ اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ ہر کتابی حضرت عیسیٰ کی وفات سے پہلے یا اپنی وفات سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لے کر آئے گا۔اور ہر کتابی کا مستقبل میں حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ حضرت عیسیٰ اس دنیا میں دوبارہ تشریف نہ لے آئیں۔

کتاب مقدس کی درج ذیل آیات سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ خود حضرت مسیح نے بھی اپنی آمد ثانی کے بارے میں اپنے اصحاب کو بتلایا۔کتاب مقدس کے الفاظ ہیں:

’’اور جب وہ زیتون کے پہاڑ پر بیٹھا تھا،اس کے شاگردوں نے الگ اس کے پاس آ کر کہا ہم کو بتا کہ یہ باتیں کب ہوں گی؟ اور تیرے آنے اور دنیا کے آخر ہونے کا نشان کیا ہو گا؟ یسوع نے جواب میں ان سے کہا خبردار! کوئی تم کو گمراہ نہ کر دے۔ کیونکہ بہتیرے میرے نام سے آئیں گے اور کہیں گے میں مسیح ہوں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔‘‘(متی۲۴: ۳-۵)

ایک اور جگہ کتاب مقدس میں یہ الفاظ ہیں:

’’جب وہ زیتون کے پہاڑ پر ہیکل کے سامنے بیٹھا تھا تو پطرس اور یعقوب اور یوحنا اور اندریاس نے تنہائی میں اس سے پوچھا۔ہمیں بتا یہ باتیں کب ہوں گی؟ اور جب یہ سب باتیں پوری ہونے کو ہوں اس وقت کا کیا نشان ہے؟ یسوع نے ان سے کہنا شروع کیا کہ خبردار کوئی تم کو گمراہ نہ کر دے۔ بہتیرے میرے نام سے آئیں گے اور کہیں گے کہ وہ میں ہی ہوں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔‘‘(مرقس۱۳: ۳-۶)

ایک جگہ کتاب مقدس میں ہے:

’’انھوں نے اس سے پوچھا کہ اے استاد، پھر یہ باتیں کب ہوں گی؟ اور جب وہ ہونے کو ہوں اس وقت کا کیا نشان ہے؟ اس نے کہا خبردار! گمراہ نہ ہونا، کیونکہ بہتیرے میرے نام سے آئیں گے اور کہیں گے کہ وہ میں ہی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہوں اور یہ بھی کہ وقت نزدیک آ پہنچا ہے۔‘‘ (لوقا ۲۱: ۷-۹)

ایک اور جگہ کتاب مقدس میں ہے:

’’میں تیرے پاس جلد آنے کی امید کرنے پر بھی یہ باتیں تجھے اس لیے لکھتا ہوں کہ اگر مجھے آنے میں دیر ہو تو تجھے معلوم ہو جائے کہ خدا کے گھر یعنی زندہ خدا کی کلیسیا میں جو حق کا ستون اور بنیاد ہے، کیونکر برتاؤ کرنا چاہیے۔‘‘ (تیمتھیس ۳: ۱۴-۱۵)

غامدی صاحب نے جس طرح مسئلۂ موسیقی میں قرآن میں موجود موہوم اشارات کو بنیاد بنا کر کتاب مقدس کی آیات کی صحت کی تصدیق کی اور ان سے موسیقی کے جواز پر استدلال کیا کاش کہ وہ قرآن کے حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کے بارے میں واضح بیان کو واضح نہ سہی کم از کم اشارات کا درجہ تو دے دیتے اور اس آیت کی تفسیر میں جلیل القدر مفسرین سے نہ سہی کتاب مقدس سے ہی استفادہ کر لیتے یا صاحب قرآن کی حضرت عیسیٰ سے متعلقہ احادیث کو بنیاد بنا کر کتاب مقدس کی ان آیات کی صحت کی تصدیق کرتے، اور حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی پر اور کہیں سے نہ سہی، انھی آیات کتاب مقدس سے استدلال کر لیتے اور ایک غلط اصول کو ہی سہی، استعمال کرتے ہوئے ایک صحیح عقیدے تک پہنچ جاتے۔

غامدی صاحب سے ہمارا یہ سوال ہے کہ اگر قرآن کے اشارات سے کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق ہو سکتی ہے تو قرآن میں تو حضرت عیسیٰ کی آمد کے بارے میں ان اشارات سے بہت قوی اشارات موجود ہیں جو کہ غامدی صاحب مسئلۂ موسیقی کے جواز کے حق میں قرآن سے پیش کرتے ہیں؟ غامدی صاحب سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر قرآن کے بیان سے کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق ہو جاتی ہے تو کیا صاحب قرآن کے بیان سے کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق نہیں ہوتی؟ اگر صاحب قرآن کے فرامین سے بھی کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق ہوتی ہے تو غامدی صاحب کو چاہیے کہ حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کے بارے میں مروی روایات کو بنیاد بنا کر وہ کتاب مقدس کی ان آیات کی تصدیق کریں جو حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کے بارے میں ہیں۔ اور کتاب الٰہی سے حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کو ثابت کریں۔ اگر ان کے نزدیک صاحب قرآن کے فرامین سے کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق نہیں ہوتی تو انھیں اپنے اس اصول کے بارے میں کوئی شرعی دلیل پیش کرنی چاہیے کہ قرآن کے بیان سے تو کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ محفوظ ہیں اور کلام الٰہی ہیں اور صاحب قرآن کے فرامین سے کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق نہیں ہوتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا

اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ رجم بھی زنا کی سزاؤں میں سے ایک سزا ہے۔شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بھی شریعت موسوی کی طرح زنا کی مختلف صورتوں کے اعتبار سے مختلف سزائیں مقرر کی گئیں ہیں شریعت محمدیہ میں زنا کی تین سزائیں ہیں: سو کوڑے، تغریب عام (ایک سال کی جلاوطنی) اور رجم کی سزا۔واقعے کی نوعیت اور صورت حال کے اختلاف کی وجہ سے مختلف احوال میں مختلف سزائیں بیان کی گئیں ہیں اور بعض اوقات زنا کے کسی واقعے میں جبر و اکراہ، ظلم و زیادتی، قباحت اور شناعت کے بڑھ جانے کی وجہ سے دو سزاؤں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔جیسا کہ بعض احادیث میں زنا کی حد کے طور پر دو سزاؤں کو بھی جمع کیا گیا ہے۔اس کی بنیادی وجہ فقہ الواقع کا اختلاف ہے۔زنا کی سزا کے حوالے سے یہی وہ اختلاف ہے جو کہ ہمیں مختلف روایات میں ملتا ہے اور شریعت موسوی سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ زنا کی سزا کے حوالے سے فقہ الواقع کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور مختلف احوال میں واقعے کی قباحت اور شناعت کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔اسی لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شریعت موسوی میں بھی زنا کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف سزائیں بیان ہوئی ہیں جیسا کہ تورات کی ذیل میں بیان شدہ آیات سے پتا چلتا ہے۔شریعت محمدیہ اور شریعت موسوی، دونوں میں زنا کی ایک مخصوص صورت کی سزا رجم بیان ہوئی ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ اگر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو ایسے زانی کی سزا رجم ہے۔لیکن غامدی صاحب نے شادی شدہ زانی مرد و عورت کے لیے رجم کی سزا کا انکار کیا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں یہ قرآن سے ثابت نہیں ہے۔حالانکہ شادی شدہ زانی کے لیے یہ سزا قرآن سے بھی ثابت ہے، حدیث سے بھی ثابت ہے، فطرت صحیحہ سے بھی ثابت ہے، عقل سلیم سے بھی ثابت ہے اور کتاب مقدس سے بھی شادی شدہ زانی اور اس قسم کے زنا کے لیے رجم کی سزا ثابت ہوتی ہے اور یہ حکم اب بھی کتاب مقدس میں موجود ہے۔

کتاب مقدس میں ایک جگہ ذکر ہے:

''پر اگر یہ بات سچ ہو کہ لڑکی میں کنوارے پن کے نشان نہیں پائے گئے تو وہ اس لڑکی کو اس کے باپ کے گھر کے دروازہ پر نکال لائیں اور اس کے شہر کے لوگ اسے سنگسار کریں کہ وہ مر جائے، کیونکہ اس نے اسرائیل کے درمیان شرارت کی کہ اپنے باپ کے گھر میں فاحشہ پن کیا۔یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا۔اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی۔یوں تو اسرائیل سے ایسی برائی کو دفع کرنا۔اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منسوب ہوگئی ہواور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگ سار کر دینا کہ وہ مر جائیں، لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہم سایہ کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا...اگر کسی آدمی کو کوئی کنواری لڑکی مل جائے جس کی نسبت نہ ہوئی ہو اور وہ اسے پکڑ کر اس سے صحبت کرے اور دونوں پکڑے جائیں تو وہ مرد جس نے اس سے صحبت کی ہو لڑکی کے باپ کو چاندی کی پچاس مثقال دے اور وہ لڑکی اس کی بیوی بنے، کیونکہ اس نے اسے بے حرمت کیا اور وہ اسے اپنی زندگی بھر طلاق نہ دینے پائے۔‘‘

(استثناء:۲۰،۲۲-۲۴،۲۸-۲۹)

زنا کی سزاؤں میں سے رجم بھی ایک سزا ہے۔ اس پر آسمانی کتابوں کا اجماع ہے، چونکہ فطرت صحیحہ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ زنا کی بعض صورتوں میں بدترین بے حیائی اور انسانیت سے خروج پایا جاتا ہے، اس لیے تمام مذاہب میں زنا کی سزاؤں میں سے ایک سزا شدید ترین رہی ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

عن البراء بن عازب قال مر علی النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم بیهودی محمما مجلودا فدعاهم فقال هکذا تجدون حد الزانی فی کتابکم؟ قالوا نعم، فدعا رجلا من علمائهم فقال انشدك باللّٰه الذی انزل التوراة علی موسیٰ علیه الصلاة والسلام اهکذا تجدون حد الزانی فی کتابکم؟ قال لا ولولا انك نشدتنی بهذا لم اخبرك، نجده الرجم ولکنه کثر فی اشرافنا فکنا اذا اخذنا الشریف ترکناه و اذا اخذنا الضعیف اقمنا علیه الحد قلنا تعالوا فلنجتمع علی شیء نقیمه علی

’’حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک یہودی کو گزارا گیا جو کوئلے سے کالا کیا گیا اور کوڑے کھائے ہوئے تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی یہی سزا پاتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عالموں میں سے ایک شخص کو بلایا اور اس سے کہا: میں تمھیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تورات کو حضرت موسیٰ پر نازل کیا، کیا تم اس طرح زانی کی حد اپنی کتاب تورات میں پاتے ہو؟ اس یہودی عالم نے جواب دیا: نہیں، اور اگر آپ مجھے یہ قسم نہ دیتے تو میں آپ کو اس کی خبر نہ دیتا، ہماری کتاب میں تو رجم کی سزا ہے،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

الشـريف و الوضيع فجعلنا التحميم و الـجـلـد مكان الرجم فقال رسول اللّٰه صـلـى الـلّٰه عليه و سلم اللّٰهم انى اول من احيى امرك اذ اماتوه فامر به فرجم فـانـزل اللّٰه عز و جل يا ايها الرسول لا يحزنك الذين يسارعون فى الكفر الى قوله تعالٰى ان اوتيتم هذا فخذوه يقول ائتـوا مـحـمـدا فـان امركم بالتحميم والـجـلـد فـخذوه وان افتاكم بالرجم فاحذروا فانزل اللّٰه ومن لم يحكم بما انزل اللّٰه فاولئك هم الكفرون ومن لم يـحـكـم بـمـا انـزل الـلّٰـه فاولئك هم الـظلمون ومن لم يحكم بما انزل اللّٰه فـاولـئك هـم الـفسقون فى الكفار كلها. (صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا)

لیکن جب زنا ہمارے عزت دار آدمیوں میں پھیل گیا تو جب ہم کسی امیر آدمی کو اس جرم میں پکڑ لیتے تو چھوڑ دیتے تھے اور جب کسی کمزور آدمی کو اس جرم میں پکڑ لیتے تو اس پر رجم کی حد جاری کر دیتے۔ تو اس وقت ہم نے کہا کہ ہم سب جمع ہو جائیں اور ایک سزا ایسی مقرر کر لیں جو کہ ہم امیر کو بھی دیں اور غریب کو بھی، تو ہم نے منہ کو کالا کرنا اور کوڑوں کی سزا رجم کے مقابلے میں مقرر کی۔ تو اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ، میں سب سے پہلے تیرے اس حکم کو زندہ کرتا ہوں جس کو انھوں نے ختم کر دیا تھا۔ تو آپ نے اس یہودی کے بارے میں حکم دیا اور اس کو رجم کیا گیا۔ اس موقع پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے 'یا ايها الرسول لا يحزنك الذين يسارعون فى الكفر' سے لے کر 'ان اوتيتم هذا فخذوه' تک آیات نازل فرمائیں۔ یہودیہ کہتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آؤ اگر وہ تمھیں منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کا حکم دیں تو ان کی بات مان لینا اور اگر وہ تمھیں زانی کے بارے میں رجم کا فتویٰ دیں تو قبول نہ کرنا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں: 'ومن لم يحكم بما انزل اللّٰه فاولئك هم الكفرون ... ومن لم يحكم بما انزل اللّٰه فاولئك هم الظلمون ...، ومن لم يحكم بما انزل اللّٰه فاولئك هم الفسقون' یہ سب آیات کافروں کے بارے میں اتریں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس حدیث سے درج ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔قرآن نے تورات کے حکم رجم کی 'وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ' کی آیات نازل کر کے تصدیق فرمائی ہے کہ تورات میں یہ حکم موجود ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

۲۔حکم رجم کو 'مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ' کہہ کر قرآن نے خود بھی حکم رجم کا اثبات کیا۔

ہم غامدی صاحب سے یہی عرض کریں گے کہ ان کے بقول اگرچہ قرآن میں محصن زانی کے لیے رجم کی سزا نہیں ہے، لیکن اس حدیث کو سامنے رکھیں تو علم میں کم از کم اتنا ضرور اضافہ ہوتا ہے کہ موسیقی کے جواز کے اشارات سے زیادہ قوی اور یقینی اشارات قرآن میں رجم کی سزا کے لیے موجود ہیں۔کاش کہ غامدی صاحب اپنے اصول ہی کا اطلاق کرتے ہوئے ان اشارات قرآنی کو سامنے رکھتے اور ان کی روشنی میں تورات میں موجود زنا کی مختلف سزاؤں میں سے ایک سزا 'حد رجم' کا بھی اثبات کرتے۔جس کتاب اللہ کے غامدی صاحب قائل ہیں، اس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اور آج بھی رجم کی سزا کو زنا کی حدود میں سے ایک حد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تورات کی یہ آیات اس اعتبار سے محفوظ ہیں کہ زنا کی سزاؤں میں سے ایک سزا رجم بھی ہے۔لیکن غامدی صاحب رجم کو زنا کی سزا ماننے سے ہی انکاری ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کے نزدیک زانی چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، دونوں صورتوں میں اس کی سزا سو کوڑے ہے، حالانکہ غامدی صاحب کا یہ موقف قرآن، کتاب مقدس، احادیث، اجماع امت، فطرت صحیحہ کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی خلاف ہے۔کتنی سادہ سی بات ہے کہ اگر کوئی غیر شادی شدہ عورت کسی غیر شادی شدہ مرد کے ساتھ زنا کی مرتکب ہوتی ہے تو اللہ کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے ان کی ایک سزا مقرر کی گئی ہے، لیکن اگر کوئی شادی شدہ عورت یا مرد زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اب صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے اور دوسری طرف اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے جائز راستہ ہونے کے باوجود اللہ کی نافرمانی کی۔تیسرا یہ کہ خاوند یا بیوی کے حقوق تلف ہوئے اور جذبات مجروح ہوئے۔چوتھا خاندان کا شیرازہ بکھرنے کی صورتیں جمع ہوئیں۔ان مفسدات کو پہلی صورت سے کہیں زیادہ بعد حاصل ہے، اسی لیے دوسری صورت کی سزا مختلف رکھی گئی ہے۔یہی وہ بنیادیں ہیں جن کی وجہ سے مغربی ممالک میں بھی ان دونوں قسم کے احوال کے لیے مختلف قوانین وضع کیے گئے ہیں جن کی سراسر بنیاد ہی عقل و مشاہدہ ہے۔بہت سارے مغربی ممالک کے قوانین میں بھی زنا کی سزا کے حوالے سے

شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا فرق کیا گیا ہے۔

شخص دجال کا انکار

تیسرا مسئلہ جو کہ غامدی صاحب کے اصولوں کے مطابق درست ہے، لیکن انھوں نے اس کا انکار کیا ہے، وہ دجال کی تعیین ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک دجال ایک شخص نہیں ہے، بلکہ صفت ہے اور یاجوج ماجوج ہی اصل میں دجال ہے۔ دجال سے متعلقہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے قریب یاجوج وماجوج ہی کے خروج کو دجال کے خروج سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج وماجوج کی اولاد، یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر وفلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا۔''

(ماہنامہ اشراق، جنوری ۱۹۹۶، ۶۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب نے دجال کے شخص ہونے کا انکار کیا، حالانکہ دجال کا ایک شخص ہونا اور حضرت عیسیٰ کا اس کو ہلاک کرنا واضح طور پر احادیث اور کتاب مقدس میں موجود ہے۔ کتاب مقدس میں ہے:

''کسی طرح کسی کے فریب میں نہ آنا، کیونکہ وہ دن نہیں آئے گا جب تک کہ پہلے برگشتگی نہ ہو اور وہ گناہ کا شخص یعنی ہلاکت کا فرزند ظاہر نہ ہو۔ جو مخالفت کرتا ہے اور ہر ایک سے جو خدا یا معبود کہلاتا ہے اپنے آپ کو بڑا ٹھہراتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے مقدس میں بیٹھ کر اپنے آپ کو خدا ظاہر کرتا ہے۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ جب میں تمھارے پاس تھا تو تم سے یہ باتیں کہا کرتا تھا؟ اب جو چیز اسے روک رہی ہے تاکہ وہ اپنے خاص وقت پر ظاہر ہو، اس کو تم جانتے ہو۔ کیونکہ بے دینی کا بھید تو اب بھی تاثیر کرتا جاتا ہے، مگر اب ایک روکنے والا ہے اور جب تک کہ وہ دور نہ کیا جائے، روکے رہے گا۔ اس وقت وہ بے دین ظاہر ہوگا جسے خداوند یسوع اپنے منہ کی پھونک سے ہلاک اور اپنی آمد کی تجلی سے نیست کرے گا اور جس کی آمد شیطان کی تاثیر کے موافق ہر طرح کی جھوٹی قدرت اور نشانوں اور عجیب کاموں کے ساتھ اور ہلاک ہونے والوں کے لیے ناراستی کے ہر طرح کے دھوکے کے ساتھ ہوگی۔''

(تھسلنیکیوں ۲: ۳-۱۰)

اگر ہم ذیل میں دی گئی دو احادیث پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دجال کے بارے میں اسی قسم کی تعلیمات دی ہیں جو کہ کتاب مقدس میں موجود ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ صحابۂ کرام کو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کی جیسے کہ

وہ اس کے لائق ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا تذکرہ کیا اور فرمایا:

انی انذرکموہ و ما من نبی الا انذر قومہ لقد انذرہ نوح قومہ و لکن سا قول لکم فیہ قولا لم یقل نبی لقومہ تعلمون انہ اعور و ان اللّٰہ لیس باعور.
(صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب یعرض السلام علی الصبی)

''میں تمھیں اس (دجال) سے ڈراتا ہوں اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو۔ یقیناً حضرت نوح نے بھی اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا تھا، لیکن میں تمھیں دجال کے بارے میں ایک ایسی بات بتا رہا ہوں جو کہ کسی بھی نبی نے اس سے پہلے اپنی قوم کو نہیں بتائی، تم جان لو کہ دجال کانا ہے اور (معاذ اللہ) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کانا نہیں ہے۔''

یہ حدیث دجال کے بارے میں کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق کر رہی ہے، کیونکہ حدیث میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا اور حضرت عیسیٰ بھی اس میں شامل ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں الفاظ ہیں کہ حضرت مجمع بن جاریہ بیان فرماتے ہیں:

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول یقتل ابن مریم الدجال بباب لد.
(سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی قتل عیسیٰ ابن مریم الدجال)

''میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم دجال کو مقام 'لد' پر قتل کریں گے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ حدیث بھی کتاب مقدس کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم دجال کو قتل کریں گے۔ کتاب مقدس کی مذکورہ بالا آیات اور احادیث مبارکہ سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دجال ایک شخص معین کا نام ہے جو قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ کتاب مقدس میں ایک اور جگہ ذکر ہے:

''اس وقت اگر کوئی تم سے کہے کہ دیکھو مسیح یہاں ہے یا وہاں ہے تو یقین نہ کرنا۔ کیونکہ جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہوں گے اور ایسے بڑے نشان اور عجیب کام دکھائیں گے کہ اگر ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گمراہ کر لیں۔''

(متی ۲۴/ ۲۳-۲۴)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بارے میں ایک حدیث بھی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ آپ نے ہمیں ایک دن دجال کے بارے میں ایک لمبی حدیث بیان فرمائی۔ اس میں آپ نے فرمایا کہ دجال ایک

دن مدینہ کا رخ کرے گا، لیکن اس کے لیے شہر مدینہ میں داخلہ ممکن نہ ہوگا اور وہ مدینہ کے باہر قیام کرے گا تو ایک دن اہل مدینہ میں سے ایک انتہائی نیک آدمی اس کے پاس آئے گا اور وہ آدمی دجال سے کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو دجال ہے، تو اس وقت دجال لوگوں سے کہے گا:

ارایتم ان قتلت ھذا ثم احییتہ اتشکون فی الامر فیقولون لا فیقتلہ فیقول حین یحییہ واللّٰہ ما کنت فیك قط اشد بصیرۃ منی الآن قال فیرید الدجال ان یقتلہ فلا یسلط علیہ.
(صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب فی صفۃ الدجال)

''بھلا تم دیکھو اگر میں اس شخص کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دوں تو کیا تم پھر بھی میرے بارے میں شک کرو گے تو وہ لوگ کہیں گے نہیں تو اس وقت دجال اس نیک آدمی کو قتل کر دے گا اور جب دجال اس نیک آدمی کو دوبارہ زندہ کرے گا تو وہ نیک آدمی اس سے کہے گا: اللہ کی قسم، اب تو مجھے تیرے بارے میں حد درجہ یقین ہو گیا ہے کہ تو وہی مسیح الدجال ہے۔ پس دجال اس آدمی کو دوبارہ قتل کرنا چاہے گا، لیکن کامیاب نہ ہوگا۔''

یہ حدیث بھی کتاب مقدس کی درج بالا آیت کی تصدیق کر رہی ہے کہ دجال ایک بہت بڑا شعبدہ باز ہوگا۔ بہرحال احادیث دجال کے بارے میں کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے علاوہ عیسائی دنیا بھی جس دجال کو اپنی کتابوں کے حوالے سے جانتی ہے وہ ایک معین شخص ہے نہ کہ ایک صفت یا یاجوج ماجوج یا امریکا۔ میرے خیال میں صاحب قرآن کی کتاب مقدس کی آیات کی اس تصدیق کے بعد غامدی صاحب کو شخص دجال کی آمد کا اقرار کر لینا چاہیے۔ احادیث کی بنیاد پر نہ سہی، کتاب مقدس کی آیات سے ہی سہی۔

اہل سنت اور سابقہ کتب سماویہ

اصولیین نے اصول فقہ کی کتابوں میں 'شرائع من قبلنا' کے عنوان کے تحت یہ بحث کی ہے کہ کیا سابقہ شرائع ادلۂ تشریع میں سے ہیں یا نہیں؟ یعنی کیا 'شرائع من قبلنا' امت مسلمہ کے لیے مآخذ شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں یا نہیں؟ اس ساری بحث کا خلاصۂ کلام یہی ہے کہ سابقہ شرائع کے وہ احکامات جو کہ ہماری شریعت میں ثابت یا مذکور ہوں ہمارے حق میں حجت بن سکتے ہیں۔

اول الذکر کے بارے میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ یعنی جو حکم پچھلی شریعتوں میں ثابت ہو اور ہماری شریعت

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

نے بھی اس کا بطور حکم اثبات کیا ہوتو اس پر عمل کرنا ہمارے لیے مشروع ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہماری شریعت نے اس حکم کا اثبات کیا ہے اور اس کو ہمارے حق میں برقرار رکھا ہے۔

جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں فقہا کا اختلاف ہے کہ ایسے احکامات جو پچھلی شریعتوں میں تو بطور حکم موجود تھے، لیکن ہماری شریعت یعنی قرآن وسنت میں ان کا تذکرہ بطور خبر کے ہوا ہے، کیا ایسے احکامات ہمارے حق میں حجت ہیں یا نہیں؟ بعض فقہا کی رائے یہ ہے کہ پچھلی شریعتوں کے ایسے احکامات جو قرآن وسنت میں خبر کے انداز میں بیان ہوئے ہیں، شارع کا ہماری شریعت یعنی قرآن وسنت میں ان احکامات کو بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمارے حق میں بھی مشروع ہیں جبکہ جمہور فقہا کا موقف یہ ہے کہ ایسے احکامات کا ہماری شریعت میں صرف بیان کر دینا ہی کافی نہیں ہے، جب تک کہ اس بات کی کوئی واضح دلیل نہ مل جائے کہ ان احکامات کو ہمارے حق میں باقی رکھنا شارع کا مقصود ہے، اور یہی مسلک دلائل کی روشنی میں راجح ہے۔ علماے اصول نے اس بحث کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلی قسم

ایسے احکامات جو پچھلی شریعتوں میں موجود ہیں اور ہماری شریعت نے آ کر ان کو منسوخ کر دیا ہے، ان کے بارے میں فقہا کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان پر عمل کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ مثلاً سجدۂ تعظیمی۔

دوسری قسم

ایسے احکامات جن کا ذکر ہماری شریعت یعنی کتاب وسنت میں نہیں ہے، لیکن پچھلی شریعتوں میں ہمیں ان کا تذکرہ ملتا ہے، احکامات کی اس قسم کے بارے میں بھی فقہا کا اتفاق ہے کہ ایسے احکامات ہمارے لیے کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتے۔

تیسری قسم

ایسے احکامات جن کا تذکرہ پچھلی شریعتوں میں ملتا ہے اور ہماری شریعت میں بھی یہ احکام موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری شریعت میں اس بات کی دلیل بھی ملتی ہے کہ یہ احکامات اسی طرح ہمارے لیے فرض ہیں جیسے کہ پہلی امتوں کے لیے فرض تھے، مثلاً روزہ رکھنا وغیرہ۔ ان احکامات پر عمل کرنا ہمارے حق میں حجت ہے اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، لیکن ان احکامات پر ہم اس وجہ سے عمل کرتے ہیں کہ ہماری شریعت نے ان کو ہمارے لیے فرض قرار دیا ہے۔ اس قسم کے احکامات کے بارے میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان فرماتے ہیں:

وھذا النوع من الاحکام لا خلاف فی انه شرع لنا، و مصدر شرعیته و حجیته	''اس قسم کے احکامات بغیر کسی اختلاف کے ہمارے لیے شریعت ہیں، لیکن ان کا ہمارے حق میں شریعت

بالنسبة الینا هو نفس نصوص شریعتنا.
(الوجیز، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ۲۶۳)

اور حجت ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ ہماری شریعت کی نصوص سے ثابت ہیں۔''

چوتھی قسم

پچھلی شریعتوں کے وہ احکامات جن کا صرف تذکرہ ہماری شریعت میں ملتا ہے، لیکن ہماری شریعت میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو کہ اس بات کی طرف رہنمائی کرے کہ یہ احکامات ہمارے حق میں ثابت ہیں یا نہیں، احکامات کی اس قسم کے بارے میں علما کے تین اقوال ہیں:

(ا) اکثر علماے احناف اور مالکیہ کے نزدیک یہ احکامات ہمارے لیے حجت ہیں، کیونکہ ان فقہا کے نزدیک ان احکامات کا ہماری شریعت میں مذکور ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ شارع نے ان احکامات کو ہمارے حق میں برقرار رکھا ہے۔

(ب) شوافع، حنابلہ، اشاعرہ، معتزلہ اور شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ احکامات ہمارے حق میں حجت نہیں ہیں اور اس قول کو امام غزالی، امام رازی، علامہ آمدی، علامہ ابن حزم اور متاخرین علماے اصول نے پسند کیا ہے اور اسی موقف کو جناب غامدی صاحب کے امام امین احسن اصلاحی صاحب نے اختیار کیا۔

(ج) بعض اصولیین مثلاً ابن برہان اور ابن قشیری کا کہنا یہ ہے کہ اس بارے میں توقف کیا جائے گا۔

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان اصولیین کے اس اختلاف کے بارے میں فرماتے ہیں:

والحق ان هذا الخلاف غیر مهم، لانه لا یترتب علیه اختلاف فی العمل، فما من حکم من احکام الشرائع السابقة، قصه اللّٰه علینا، او بینه الرسول لنا، الا وفی شریعتنا ما یدل علی نسخه او بقائه فی حقنا سواء جاء دلیل الا بقاء او النسخ فی سیاق النص الذی حکی لنا حکم الشرائع السابقة، او جاء ذلك الدلیل فی مکان آخر من نصوص الکتاب والسنة.
(الوجیز، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ۲۶۵)

''اور حق بات تو یہ ہے کہ یہ اختلاف اتنا اہم نہیں ہے، کیونکہ عملی طور پر اس مسئلے میں کوئی اختلاف مرتب نہیں ہوتا، کیونکہ پچھلی شریعتوں کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے قرآن میں بیان کیا ہو یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واضح کیا ہو اور ہماری شریعت میں کوئی نہ کوئی ایسی دلیل مل جاتی ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وہ حکم ہمارے حق میں منسوخ ہے یا باقی ہے، اور بعض اوقات اس حکم کو باقی رکھنے یا منسوخ کرنے کی دلیل ساتھ ہی مذکور ہوتی ہے اور بعض اوقات کتاب و سنت کی نصوص میں کسی اور جگہ اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس اعتبار سے حقیقت یہی ہے کہ اصولیین کا یہ اختلاف صرف لفظی ہے، کیونکہ کوئی بھی ایسا حکم نہیں ہے جو کہ سابقہ شرائع کے حوالے سے کتاب وسنت میں بیان ہوا ہو اور اس کے منسوخ ہونے یا باقی رکھنے کی کوئی صراحت نصوص قرآن وسنت میں وارد نہ ہوئی ہو۔لہٰذا اس مسئلے میں فقہا کی کوئی سی بھی رائے اختیار کر لی جائے ہر صورت میں ہمارے لیے مآخذ ومصدر قرآن وسنت ہی بنتے ہیں نہ کہ کتاب مقدس، جیسا کہ غامدی صاحب کا خیال ہے۔

پانچویں قسم

'شرائع من قبلنا' سے استدلال کے اعتبار سے پانچویں قسم وہ ہے جس کو ہم غامدی صاحب کے حوالے سے سطور بالا میں بیان کر چکے ہیں۔غامدی صاحب کے نزدیک کتاب مقدس کے احکامات امت مسلمہ کے لیے بھی اسی طرح شریعت کا درجہ رکھتے ہیں جس طرح پچھلی امتوں کے لیے، بشرطیکہ وہ قرآنی مندرجات سے محفوظ ثابت ہو جائیں اور قرآنی مندرجات سے ان کی مراد قرآن کے الفاظ، اشارات، اور اجمالی بیانات وغیرہ ہیں۔ہمارے علم کی حد تک غامدی صاحب اپنے اس بیان میں منفرد ہیں۔سلف صالحین میں سے کسی نے بھی یہ قسم بیان نہیں کی جو کہ غامدی صاحب بیان کر رہے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خلاصۂ کلام

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کے بعد امت مسلمہ کے لیے اصل مآخذ ومصادر قرآن وسنت ہی ہیں۔سابقہ کتب سماویہ اپنے اپنے ادوار میں اپنی قوموں کے لیے ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ تھیں۔کتاب مقدس قانون سازی میں ہمارے لیے ماخذ ومصدر کی حیثیت نہیں رکھتی۔ہاں اس حد تک کہنا ٹھیک ہے کہ 'حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج' جیسی تعلیمات کے مصداق کے طور پر قوم بنی اسرائیل سے متعلقہ قرآنی واقعات اخبار وقصص کی تکمیل کے لیے ہم کتاب مقدس کی عبارات سے استفادہ کر سکتے ہیں، لیکن کسی قرآنی واقعے کی تکمیل کے لیے کتاب مقدس سے کیے جانے والے اس استفادے کی بنا پر کوئی حتمی رائے قائم کر لینا 'لا تصدقوا اهل الکتاب ولا تکذبوهم' کے منافی ہے۔جہاں تک احکام میں کتاب مقدس سے استدلال کرنے کا معاملہ ہے تو اس کی کوئی دلیل نقل وعقل میں نہیں ملتی۔

منظور الحسن

غامدی صاحب کے تصور 'کتاب' پر اعتراضات کا جائزہ

ماہنامہ ''الشریعہ'' کے مئی ۲۰۰۶ کے شمارے میں جناب حافظ محمد زبیر کا مضمون ''علامہ جاوید احمد غامدی کا تصور کتاب'' شائع ہوا تھا جو اب ان کی تصنیف ''فکر غامدی ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ'' کا حصہ ہے۔ اس مضمون میں فاضل ناقد نے یہ مقدمہ قائم کیا ہے کہ جناب جاوید احمد غامدی قدیم آسمانی صحائف کو دین و شریعت کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مقدمہ صریح طور پر غلط ہے۔ غامدی صاحب کی تصانیف میں اس کے اثبات کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے اور اس ضمن میں فاضل ناقد کے جملہ اعتراضات سرتا سر سوء فہم پر مبنی ہیں۔ ذیل میں غامدی صاحب کے تصور کتاب کے حوالے سے بعض اصولی مباحث کی تقدیم کے ساتھ فاضل ناقد کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قدیم صحائف کی صحت اور ان سے استناد

دین میں قدیم آسمانی صحائف کا جو بھی مقام متعین کیا جائے، پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ان صحائف کے متن محفوظ ہیں اور لائق استناد ہیں یا تحریف شدہ ہیں اور اس بنا پر اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے رجوع کیا جائے؟ اس مسئلے کے بارے میں علما کے ہاں تین مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اصلاً محفوظ ہیں اور جہاں تک تحریف کا تعلق ہے تو وہ ان کے متن میں نہیں، بلکہ ان کی تعبیر و تشریح میں ہوئی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اپنے متن کے لحاظ سے یہ وہ کتابیں ہی نہیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے حامل پیغمبروں پر نازل کیا تھا۔ ان کا بیش تر حصہ

یک سر تبدیل ہو چکا ہے۔ تیسری رائے ان کے بین بین یہ ہے کہ ان میں کچھ ترمیم و اضافہ تو ضرور ہوا ہے، مگر ان کا زیادہ تر حصہ اپنی اصل صورت ہی پر قائم ہے۔

امام ابن قیم نے اپنی کتاب ''اغاثۃ اللھفان'' میں تورات کے حوالے سے یہی تین آرا بیان کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

وقد اختلف اقوال الناس فی التوراة التی بایدیھم ھل ھی مبدلة ام التبدیل والتحریف وقع فی التاویل دون التنزیل علی ثلاثة اقوال طرفین ووسط. فافرطت طائفة وزعمت انها کلها او اکثرها مبدلة مغیرة لیست التوراة التی انزلها اللّٰه تعالیٰ علی موسٰی علیه السلام وتعرض ھولاء لتناقضها وتکذیب بعضها لبعض وغلا بعضھم فجوز الاستجمار بها من البول وقابلھم طائفة اخری من ائمة الحدیث والفقه والکلام فقالوا بل التبدیل وقع فی التاویل لا فی التنزیل وھذا مذھب ابی عبد اللّٰه محمد بن اسماعیل البخاری قال فی صحیحه یحرفون یزیلون ولیس احد یزیل لفظ کتاب من کتب اللّٰه تعالیٰ ولکنھم یحرفونه یتاولونه علی غیر تاویله وھذا اختیار الرازی فی تفسیره وسمعت شیخنا یقول وقع النزاع فی ھذه المسألة بین بعض الفضلاء فاختار ھذا المذھب ووھن غیره

''یہود کے پاس جو تورات موجود ہے، آیا وہ تبدیل شدہ ہے یا تبدیلی اور تحریف صرف اس کی تعبیر و تشریح میں واقع ہوئی ہے نہ کہ اس کے الفاظ میں؟ اس بارے میں لوگوں کے ہاں تین اقوال پائے جاتے ہیں۔ دو قول انتہا پسندانہ ہیں اور ایک معتدل۔ چنانچہ ایک گروہ نے افراط سے کام لیا اور یہ دعویٰ کیا کہ تورات ساری کی ساری یا اس کا بیش تر حصہ تبدیل شدہ ہے اور یہ وہ تورات نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی۔ انھوں نے تورات میں تناقض اور اس کے بیانات کے باہمی تضاد کو نمایاں کیا اور ان میں سے بعض نے تو اس حد تک غلو سے کام لیا کہ اس کے اوراق سے استنجا کرنے کو بھی جائز کہہ دیا۔ اس کے مقابلے میں حدیث اور فقہ اور کلام کے علما کے ایک گروہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ تورات میں تحریف صرف اس کی تعبیر و تشریح میں ہوئی ہے نہ کہ اس کے الفاظ میں۔ یہ امام بخاری کا مذہب ہے۔ انھوں نے اپنی ''صحیح'' (کتاب التوحید: ابتداء باب ۵۵) میں کہا ہے کہ (النساء ۴: ۴۶ اور المائدہ ۵: ۱۳ میں وارد لفظ) 'یحرفون' کے لیے 'یزیلون' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، حالانکہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے کسی کتاب کے الفاظ مٹا نہیں سکتا، بلکہ وہ بایں معنی اس میں تحریف کرتے ہیں کہ اس کے

www.javedahmadghamidi.com

فانكر عليه فاحضر لهم خمسة عشر نقلا به ومن حجة هولاء ان التوراة قد طبقت مشارق الارض ومغاربها وانتشرت جنوبا وشمالا ولا يعلم عدد نسخها الا اللّٰه تعالٰى ومن الممتنع ان يقع التواطؤ على التبديل والتغيير فى جميع تلك النسخ بحيث لا يبقى فى الارض نسخة الا مبدلة مغيرة والتغيير على منهاج واحد وهذا مما يحيله العقل ويشهد ببطلانه. قالوا وقد قال اللّٰه لنبيه صلى اللّٰه عليه وسلم محتجا على اليهود بها قال فاتوا بالتوراة فاتلوها ان كنتم صادقين... فهذا بعض ما احتجت به هذه الفرقة. وتوسطت طائفة ثالثة وقالوا قد زيد فيها وغير الفاظ يسيرة ولكن اكثرها باق على ما انزل عليه والتبديل فى يسير منها جدا.

(۲/۳۵۱۔۳۵۴)

الفاظ وکلم کے اصل مدعا اور مفہوم سے پھیر دیتے ہیں اور کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے کسی کتاب کے الفاظ تبدیل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ بایں معنی اس میں تحریف کرتے ہیں کہ اس کے الفاظ کے اصل مدعا اور مفہوم سے پھیر دیتے ہیں۔ رازی نے بھی اپنی تفسیر میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ میں نے اپنے استاذ (امام ابن تیمیہ) کو یہ کہتے سنا کہ بعض فضلا کے مابین اس مسئلے سے متعلق نزاع پیدا ہوئی تو ان میں سے ایک نے مذکورہ رائے کو اختیار کیا اور مخالف قول کو کمزور قرار دیا۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو اس نے اس کے حق میں پندرہ حوالے پیش کر دیے۔ ان اہل علم کی دلیل یہ ہے کہ تورات زمین کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں پھیل چکی ہے اور اس کے نسخوں کی صحیح تعداد بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے، اور یہ بات محال ہے کہ ان تمام نسخوں میں اس طرح بالاتفاق تبدیلی واقع ہو جائے کہ روے زمین پر محرف نسخے ہی باقی رہ جائیں، اور ان سب نسخوں میں تحریف بھی ایک ہی طریقے پر کر دی جائے۔ یہ بات عقل کے نزدیک محال ہے اور وہ اس کے باطل ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ وہ مزید یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے خلاف دلیل پیش کرتے ہوئے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ اگر تم سچے ہو تو لاؤ تورات کو اور اس کو پڑھو۔ ... بہرحال یہ وہ بعض دلائل ہیں جو اس رائے کے قائلین پیش کرتے ہیں۔ ایک تیسرے گروہ نے درمیانہ موقف اختیار کیا

www.javedahmadghamidi.com

اور کہا ہے کہ اس میں چند معمولی الفاظ کا اضافہ اور تبدیلی کی گئی ہے، لیکن اس کا بیش تر حصہ اپنی اصل نازل شدہ صورت پر برقرار ہے، جبکہ تبدیلی اس کے بہت معمولی حصے میں ہوئی ہے۔‘‘

متعدد علماے امت بعض جزوی اختلافات کے ساتھ اسی تیسری رائے کے قائل ہیں۔

امام ابن قیم نے اپنے اور اپنے استاذ امام ابن تیمیہ کے حوالے سے تورات کے بارے میں یہی رائے نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں:

...وممن اختار هذا القول شيخنا في كتابه ’الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح‘ ... والحق احق ما اتبع فلا نغلوا غلو المستهينين لها المتمسخرين بها بل معاذ الله من ذلك ولا نقول انها باقية كما انزلت من كل وجه كالقرآن.

(اغاثۃ اللھفان ۲/ ۳۵۴، ۳۵۸)

’’...اس (تیسرے) قول کو اختیار کرنے والوں میں ہمارے استاذ (امام ابن تیمیہ) بھی شامل ہیں جنھوں نے ’الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح‘ میں یہ بات کہی ہے۔ ...اور حق بات یہ ہے کہ یہی رائے سب سے بڑھ کر پیروی کرنے کے لائق ہے، اس لیے نہ ہم ان غلو کرنے والوں کے پیچھے چلتے ہیں جو تورات کا درجہ گراتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں، بلکہ ہم اس طرز عمل سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ تورات قرآن مجید کی طرح حرف بہ حرف اسی طرح موجود ہے، جیسا کہ اس کو نازل کیا گیا تھا۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایک مختلف زاویے سے یہ بیان کیا ہے کہ یہود اپنی کتاب تورات میں جو تحریف کرتے تھے، وہ اصل متن میں نہیں، بلکہ اس کے ترجمے میں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ بعض مقاصد کے تحت اصل متن کو مخفی رکھ کر اس کی ایسی تاویلات کر دیتے تھے کہ حکم کا مدعا بالکل تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب تورات کی فی الجملہ صحت کے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:

’’یہودی تحریف لفظی تورات کے ترجمہ وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل تورات میں۔ کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ اور تحریف معنوی تاویل فاسد کا نام ہے یعنی سینہ زوری اور راہ مستقیم سے انحراف کر کے کسی آیت کو اس کے اصل معنی کے خلاف پر حمل کرنا۔ ...کتمان آیات کی یہ صورت تھی کہ بعض

احکام اور آیات کو کسی ذی عزت اور شریف کے اعزاز کی حفاظت یا کسی ریاست کے حاصل کرنے کی غرض سے پوشیدہ کر دیتے تھے کہ عوام کا اعتقاد ان سے زائل نہ ہو جائے اور یہ لوگ اس پر عمل ترک کر دینے سے نشانۂ ملامت نہ بن سکیں۔ مثلاً زانی کو سنگ سار کرنے کا حکم تورات میں مذکور تھا، مگر ان لوگوں نے اس وجہ سے کہ ان کے تمام علما نے رجم کو موقوف کر کے اس کی جگہ پر درے مارنا اور منہ کالا کر دینا تجویز کر رکھا تھا، اس حکم کو ترک کر دیا اور رسوائی کے خوف سے اس کو چھپا لیا تھا یا مثلاً جن آیتوں میں حضرت ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام کو بشارت دی گئی ہے کہ ان کی اولاد میں ایک نبی مبعوث ہو گا اور جن میں اشارہ ہے ایک ایسے مذہب کی جانب جو سرزمین حجاز میں کامل اشاعت پائے گا۔ اور اس کے سبب سے عرفات کی پہاڑیاں صدائے لبیک سے گونج اٹھیں گی اور تمام اقلیموں کے لوگ اس مقام کی زیارت کا قصد کریں گے باوجودیکہ یہ آیتیں تورات میں اب تک موجود ہیں۔ یہودی ان کی یہ تاویل کرتے تھے کہ یہ تو فقط اس مذہب کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اس کے اتباع کا امر کہاں ہے۔ اور یہ مقولہ ان کے زبان زد تھا: 'ملحمة کتبت علینا'۔ لیکن چونکہ اس رکیک تاویل کو کوئی نہ سنتا تھا اور نہ کسی کے نزدیک یہ صحیح تھی، اس لیے وہ آپس میں ایک دوسرے کو اس راز کے اخفا کی وصیت کرتے اور ہر کس و ناکس کے روبرو اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔'' (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ۱۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مولانا مودودی بیان کرتے ہیں:

''تورات ان منتشر اجزا کا نام ہے، جو سیرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔...قرآن انھی منتشر اجزا کو ''تورات'' کہتا ہے، اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزا کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو بجز اس کے کہ بعض مقامات پر جزوی احکام میں اختلاف ہے، اصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سرمو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح انجیل دراصل نام ہے ان الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیت نبی ارشاد فرمائے۔...قرآن انھی اجزا کے مجموعے کو ''انجیل'' کہتا ہے اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہو گا، وہ بھی غیر متعصّبانہ غور و تامل کے بعد بآسانی حل کیا جا سکے گا۔'' (تفہیم القرآن ۱/ ۲۳۲)

کم و بیش یہی موقف ہے جو اس ضمن میں جناب جاوید احمد غامدی نے اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک قدیم

آسمانی کتابیں اللہ کی کتابیں ہیں جو اپنے اپنے زمانوں میں انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی تھیں۔ان کا سرچشمہ وہی ہے جو قرآن مجید کا ہے۔چنانچہ قرآن مجید ان پر بالاجمال ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ان کے مختلف حاملین نے مذہبی تعصّبات کی بنا پر اگرچہ ان کے بعض اجزا ضائع کر دیے ہیں اور بعض میں تحریف کر دی ہے،اس کے باوجود ان میں الہامی شان نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور الہامی لٹریچر کے اسالیب کو جاننے والے اس سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔جناب جاوید احمد غامدی نے ان صحائف کے بارے میں یہ موقف اپنی تالیف ''ایمانیات'' میں ''کتابوں پر ایمان'' کے زیر عنوان بیان کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''اس وقت جو مجموعۂ صحائف بائیبل کے نام سے موجود ہے،اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں کسی نہ کسی صورت میں تمام پیغمبروں کو دی گئیں۔قرآن جس طرح تورات وانجیل کا ذکر کرتا ہے،اسی طرح صحف ابراہیم کا ذکر بھی کرتا ہے[1]۔اس کی تائید بقرہ وحدید کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔یہ سب کتابیں خدا کی کتابیں ہیں۔چنانچہ بغیر کسی تفریق کے قرآن بالاجمال ان پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔...

...(تورات) موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔اسے بالعموم ان پانچ صحیفوں پر مشتمل سمجھا جاتا ہے جو بائیبل کی ابتدا میں درج ہیں اور جنھیں خمسۂ موسوی (Pentateuch) کہتے ہیں۔یعنی پیدایش،خروج،احبار،گنتی اور استثنا۔ان صحیفوں کا تدبر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ پہلے چار صحیفوں میں یہ تاریخی بیانات کے ساتھ اپنے نزول کی ترتیب سے نقل ہوئی ہے اور استثنا میں اسے بالکل اسی طرح ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے،جس طرح قرآن کو مرتب کیا گیا ہے۔اپنی موجودہ صورت میں غالباً یہ پانچویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت مرتب کی گئی۔تاہم سیدنا مسیح علیہ السلام نے جس طرح اس کا ذکر کیا ہے،اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تصویب بھی اس کو کسی حد تک حاصل ہے۔

انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی جو ہدایت بنی آدم کو ملی ہے،اس کے دو حصے ہیں:ایک قانون، دوسرے حکمت۔تورات میں زیادہ تر قانون بیان ہوا ہے اور اس کا نام بھی اسی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ قرآن اسے 'هُدًى لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ'[2] (بنی اسرائیل کے لیے ہدایت) اور 'تَفۡصِيۡلًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ'[3] (ہر چیز کی تفصیل) کہتا ہے۔وہ بتاتا ہے کہ اس میں اللہ کا حکم ہے[4]،ہدایت اور روشنی ہے[5]،لوگوں کے لیے رحمت ہے[6]۔اس میں

---

[1] الاعلیٰ ۸۷:۱۹۔

[2] بنی اسرائیل ۱۷:۲۔

[3] الانعام ۶:۱۵۴۔

[4] المائدہ ۵:۴۳۔

www.javedahmadghamidi.com

شبہ نہیں کہ وہ اس میں یہود کی تحریفات کا ذکر کرتا ہے[5]، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی جو روایت (version) زمانۂ رسالت کے یہود و نصاریٰ کے پاس تھی، قرآن فی الجملہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

(زبور) اس کتاب کا نام ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ نغمات الٰہی کا مجموعہ ہے جنھیں مزامیر کہا جاتا ہے۔ بائیبل کے مجموعۂ صحائف میں زبور کے نام سے جو کتاب اس وقت شامل ہے، اس میں ۵ دیوان اور ۱۵۰ مزامیر ہیں۔ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی اگرچہ اس میں خلط ملط ہو گئے ہیں، مگر جن مزامیر پر صراحت کی گئی ہے کہ داؤد علیہ السلام کے ہیں، ان میں الہامی کلام کی شان ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔ انجیل کی طرح یہ بھی ایک صحیفۂ حکمت ہے اور خدا کی نازل کردہ ایک کتاب کی حیثیت سے قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔

(انجیل) مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ ان کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد آخری نبوت کی بشارت تھی۔ انجیل کے معنی بشارت کے ہیں اور یہ نام اسی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ الہامی کتابوں کے عام طریقے کے مطابق یہ بھی دعوت و انذار کی ضرورتوں کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی۔ اس سے پہلے کہ اسے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر کے محفوظ کیا جاتا، سیدنا مسیح علیہ السلام کو ان کی قوم کی سرکشی کے باعث دنیا سے اٹھا لیا گیا۔ لہٰذا یہ کوئی مرتب کتاب نہیں، بلکہ منتشر خطبات تھے جو زبانی روایتوں اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچے۔ مسیح علیہ السلام کی سیرت پر ایک مدت کے بعد بعض لوگوں نے رسائل لکھنا شروع کیے تو ان میں یہ خطبات حسب موقع درج کر دیے گئے۔ یہی رسائل ہیں جنھیں اب انجیل کہا جاتا ہے۔ مسیحیت کے ابتدائی زمانے میں یہ اناجیل بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ ۳۸۲ء میں پوپ دماسس (Damasus) کے ماتحت ایک مجلس میں کلیسا کے مذہبی پیشواؤں نے ان میں سے چار منتخب کر کے باقی ترک کر دیں اور انھیں غیر موثق (Apocryphal) قرار دے دیا۔ بائیبل کے مجموعۂ صحائف میں یہ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی اناجیل کے نام سے شامل ہیں۔ یہ ابتدا ہی سے یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، جبکہ مسیح علیہ السلام کی زبان آرامی (Aramaic) تھی اور انھوں نے اپنے مواعظ اسی زبان میں ارشاد فرمائے تھے۔ ان کے لکھنے والے بھی مسیح علیہ السلام کے بعد ان کے مذہب میں داخل ہوئے، لہٰذا ان میں سے کوئی انجیل بھی ۷۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اور انجیل یوحنا تو مسیح علیہ السلام کے ایک صدی

۵؎ المائدہ ۵: ۴۴۔

۶؎ الاعراف ۷: ۱۵۴۔

۷؎ المائدہ ۵: ۱۳۔

بعد غالباً ایشیاے کوچک کے شہر افسس میں کسی وقت لکھی گئی ہے۔ اس کے باوجود سیدنا مسیح کے جو خطبات، ارشادات اور تمثیلیں ان میں درج ہیں، ان کی الہامی شان ایسی نمایاں ہے کہ الہامی لٹریچر کے اسالیب سے واقف کوئی شخص ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن جس انجیل پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ سیرت کی ان کتابوں میں محفوظ ہے۔'' (اشراق، جون ۲۰۰۷، ۱۸)

غامدی صاحب کے درج بالا اقتباس سے زیر بحث موضوع کے بارے میں حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ تورات، زبور اور انجیل خدا کی کتابیں ہیں اور قرآن بالاجمال ان پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔

۲۔ ان میں تحریف ہوئی ہے۔

۳۔ اس کے باوجود ان میں الہامی شان نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

۴۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے جن صحائف پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے، ان کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دین کے اخذ و استنباط میں قدیم صحائف کی حیثیت

قدیم صحائف کے بارے میں دوسری بحث اس سوال پر مبنی ہے کہ یہ صحف سماوی جن پر قرآن نے ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے، کیا انھیں دین کے مآخذ کی حیثیت بھی حاصل ہے؟ علماے امت نے اس کا جواب نفی میں دیا ہے۔ جناب جاوید احمد غامدی کا موقف بھی یہی ہے۔ ان کے نزدیک ان صحائف کو دین کے مآخذ کی حیثیت ہرگز حاصل نہیں ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ یہ حیثیت فقط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو حاصل ہے اور ان سے امت کو یہ دین دو صورتوں میں ملا ہے: ایک قرآن اور دوسرے سنت۔ چنانچہ کرۂ ارض پر یہی دو چیزیں ہیں جن سے دین اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور چیز کو دین کا ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انھوں نے بیان کیا ہے:

''دین کا تنہا ماخذ اس زمین پر اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے۔ یہ صرف انھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو ان کے پروردگار کی ہدایت میسر ہو سکتی اور یہ صرف انھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دین حق قرار پائے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ. (الجمعہ ۶۲:۲)

''وہی ذات ہے جس نے اِن امیوں میں ایک رسول اِنھی میں سے اٹھایا ہے جو اُس کی آیتیں اِن پر تلاوت کرتا ہے اور اِن کا تزکیہ کرتا ہے اور (اس کے لیے) اِنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

یہی قانون وحکمت وہ دین حق ہے جسے ''اسلام'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس کے ماخذ کی تفصیل ہم اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے:

۱۔قرآن مجید

۲۔سنت ۔'' (اصول ومبادی ۹)

علوم اسلامی میں قدیم صحائف کی ضرورت اور اہمیت اور اس کا دائرہ

قدیم صحائف کے بارے میں تیسری بحث یہ ہے کہ اگر ان صحائف کو مآخذ دین کی حیثیت حاصل نہیں ہے تو پھر علوم اسلامی کے حوالے سے کیا ان کی کوئی ضرورت اور اہمیت مسلم ہے اور اگر ہے تو ان سے اخذ واستفادے کا کیا دائرہ ہے؟ اس باب میں جناب جاوید احمد غامدی کا موقف یہ ہے کہ فہم قرآن کے ایک ذریعے کی حیثیت سے قدیم آسمانی کتابوں کی اہمیت غیر معمولی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور تاریخی اعتبار سے دین کا آغاز ان بنیادی حقائق سے ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیا کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔پھر تورات، زبور اور انجیل کی صورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے اور قرآن مجید نازل ہوا ہے۔چنانچہ اس تناظر میں فہم قرآن کے ایک معاون ذریعے کی حیثیت سے سابقہ کتب سماوی کی اہمیت مسلم ہے۔اس سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے لکھا ہے:

''ان (صحائف) کے بدقسمت حاملین نے ان کا ایک حصہ اگرچہ ضائع کر دیا ہے اور ان میں بہت کچھ تحریفات بھی کر دی ہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ کی نازل کردہ حکمت اور شریعت کا ایک بڑا خزانہ اللہ تعالیٰ کے خاص اسالیب بیان میں اب بھی ان میں دیکھ لیا جا سکتا ہے۔قرآن کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس نے جگہ جگہ ان کے حوالے دیے ہیں، نبیوں کی جو سرگزشتیں ان میں بیان ہوئی ہیں، ان کی طرف بالاجمال اشارے کیے ہیں اور ان میں یہود و نصاریٰ کی تحریفات کی تردید اور ان کی پیش کردہ تاریخ پر تنقید کی ہے، اہل کتاب پر قرآن کا سارا اتمام حجت انھی صحائف پر مبنی ہے اور وہ صاف اعلان کرتا ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی ہے جو ان صحیفوں کا ہے۔'' (اصول ومبادی ۵۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تاہم، غامدی صاحب کے نزدیک فہم قرآن کے ایک معاون ذریعے کی حیثیت سے بھی ان صحائف سے اخذ و استفادے کا دائرہ یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیاے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات تک محدود ہے۔ چنانچہ ان کا اصرار ہے کہ قرآن مجید کے ان مقامات کی شرح و تفسیر کے لیے جن میں بنی اسرائیل کے انبیا کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں یا یہود و نصاریٰ کی تاریخ کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان روایتوں کو بنیاد نہیں بنانا چاہیے جو اسرائیلیات کے عنوان سے تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ ان کے بجائے قدیم صحائف ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو بہر حال اسرائیلیات سے زیادہ مستند ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیاے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔ بحث و تنقید کی ساری بنیاد انھی پر رکھی جائے گی۔ اس باب میں جو روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں، انھیں ہرگز قابل التفات نہ سمجھا جائے گا۔ ان موضوعات پر جو روشنی قدیم صحیفوں سے حاصل ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ جس طرح ان کی تفصیلات کو قبول کرتے یا ان میں بیان کردہ کسی چیز سے متعلق اصل حقائق کو واضح کرتے ہیں، اس کا بدل یہ روایتیں ہرگز نہیں ہو سکتیں جن سے نہ قرآن کے کسی طالب علم کے دل میں کوئی اطمینان پیدا ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب ہی پر وہ کسی پہلو سے حجت قرار پا سکتی ہیں۔'' (اصول و مبادی ۵۰)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قدیم صحائف سے اخذ و استفادے کا بنیادی اصول

درج بالا مباحث سے واضح ہے کہ غامدی صاحب قدیم صحائف کو من جانب اللہ تصور کرتے ہیں۔ وہ ان میں جزوی طور پر تحریف اور ترمیم و اضافہ کے قائل ہیں، تاہم ان کے نزدیک قرآن کے ان مقامات کی شرح و تفسیر میں، جن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا کوئی پہلو بیان ہوا ہے، اصل ماخذ کی حیثیت اسرائیلیات کو نہیں، بلکہ انھی صحائف کو حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی رائے کے مطابق خاص اس ضمن میں اگر قرآن کے کسی اجمال کی تفصیل ان صحائف سے معلوم ہوتی ہے تو اس سے پوری طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اخذ و استفادہ کیا مجرد ہو گا یا قرآن مجید کی روشنی میں ہو گا۔ جناب جاوید احمد غامدی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لازماً قرآن مجید کی روشنی میں ہو گا۔ قرآن کی کوئی آیت یا اس کا عرف اگر قدیم صحائف کے کسی جز کو قبول کرنے سے انکار کرے گا تو اس سے ہرگز اعتنا نہیں برتا جائے گا۔ ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ

قرآن مجید حق و باطل کے لیے میزان اور فرقان ہے اور تمام آسمانی صحیفوں پر اسے 'مہیمن' یعنی محافظ اور نگران کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''قرآن مجید اس زمین پر حق و باطل کے لیے 'میزان' اور 'فرقان' اور تمام سلسلۂ وحی پر ایک 'مہیمن' کی حیثیت سے نازل ہوا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ. (الشوریٰ ۴۲:۱۷)

''اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری، یعنی میزان نازل کی ہے۔''

اس آیت میں 'والمیزان' سے پہلے 'و' تفسیر کے لیے ہے۔ اس طرح 'والمیزان' درحقیقت یہاں 'الکتاب' ہی کا بیان ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لیے قرآن اتارا ہے جو دراصل ایک میزان عدل ہے اور اس لیے اتارا ہے کہ ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل۔ چنانچہ تولنے کے لیے یہی ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر اسے تولا جا سکے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا. (الفرقان ۲۵:۱)

''بڑی ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان اتارا ہے، اس لیے کہ وہ دنیا والوں کے لیے نذیر بنے۔''

یہ 'الفرقان' بھی اسی مفہوم میں ہے۔ یعنی ایک ایسی کتاب جو حق و باطل میں امتیاز کے لیے حجت قاطع ہے۔ یہاں بھی وہی حقیقت بیان کرنا پیش نظر ہے کہ ہر معاملے میں یہی کتاب قول فیصل اور یہی صحیفہ معیار اور کسوٹی ہے۔ تمام اختلافات میں یہی مرجع قرار پائے گی۔ اس پر کوئی چیز حاکم نہیں ہو سکتی، بلکہ علم و ہدایت کے قلم رو میں ہر جگہ اسی کی حکومت قائم ہو گی اور ہر شخص پابند ہے کہ اس پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھیرائے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ، مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ، وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ، فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ. (المائدہ ۵:۴۸)

''اور (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے، اُس کتاب کی تصدیق میں جو اس سے پہلے موجود ہے اور اُس کے لیے مہیمن بنا کر، اس لیے تم ان کے درمیان اس ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کی ہے اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔''

یہاں اسی مفہوم کے لیے لفظ 'مهیمن' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'هیمن فلان علی کذا' سے بنا ہوا اسم صفت

ہے جو محافظ اور نگران کے معنی میں آتا ہے۔ آیت میں قرآن مجید کو پچھلے صحیفوں پر 'مھیمن' قرار دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب الٰہی کا اصل قابل اعتماد نسخہ یہ قرآن مجید ہی ہے۔ چنانچہ دوسرے صحیفوں کے متن جب گم کر دیے گئے اور ان کے تراجم میں بھی بہت کچھ تحریفات کر دی گئی ہیں تو ان کے حق و باطل میں امتیاز کے لیے یہی کسوٹی اور معیار ہے۔ جو بات اس پر کھری ثابت ہوگی، وہ کھری ہے اور جو اس پر کھری ثابت نہ ہو سکے، وہ یقیناً کھوٹی ہے جسے لازماً رد ہو جانا چاہیے۔'' (اصول و مبادی ۲۵)

غامدی صاحب کے نزدیک قرآن مجید کی یہ حاکمیت صرف قدیم صحائف ہی پر نہیں، بلکہ ہر قسم کے دینی لٹریچر اور ہر سطح کی دینی شخصیت پر قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی بھی کوئی بات قبول نہیں کی جا سکتی۔ ''اصول و مبادی'' میں لکھتے ہیں:

''...قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہوگی اور اسی پر ختم کر دی جائے گی۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القا، ہر تحقیق اور ہر رائے کو اس کے تابع قرار دیا جائے گا اور اس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اس کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔'' (۲۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک قدیم صحائف کو ماخذ دین کی حیثیت ہرگز حاصل نہیں ہے۔ البتہ فہم قرآن کی شرح و وضاحت کے لیے ایک معاون ذریعے کے طور پر وہ ان کی اہمیت کو بہر حال تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم اس اہمیت کے باوجود وہ ان سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے دو چیزوں کے ملحوظ رکھنے کو لازم قرار دیتے ہیں: ایک یہ کہ اس کا دائرہ اصلاً یہود و نصاریٰ کی تاریخ اور اس کے متعلقات تک محدود رہے اور دوسری یہ کہ ان کی ہر بات کو قرآن کی میزان میں تولا جائے اور صرف اسی بات کو قبول کیا جائے جسے قرآن قبول کرنے کی اجازت دے۔ جہاں تک ایمانیات اور شریعت کے مباحث کا تعلق ہے تو ان کی رائے یہ ہے کہ اس ضمن میں اخذ و استنباط کا تمام تر انحصار اصلاً قرآن و سنت پر کرنا چاہیے۔

اعتراضات کا جائزہ

فاضل ناقد نے اپنے مضمون میں ''اصول و مبادی'' کا اقتباس نقل کر کے یہ تسلیم کیا ہے کہ غامدی صاحب احکام و

عقائد کے لیے قدیم صحائف کو مآخذ قرار نہیں دیتے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''غامدی صاحب 'میزان' میں ایک جگہ تدبر قرآن کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوم یہ کہ الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیاے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔''

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک قدیم صحائف کو یہود و نصاریٰ کے اخبار و واقعات اور قصص و تاریخ سے متعلقہ قرآنی آیات کو سمجھنے کے لیے مآخذ بنایا جائے گا نہ کہ احکام وعقائد کے لیے۔''

(فکر غامدی ۶۹)

فاضل ناقد نے یہ بات تسلیم کرنے کے باوجود اس کے بالکل برعکس یہ نقطۂ نظر قائم کیا ہے کہ غامدی صاحب کتب سماویہ کو دین اور شریعت کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ان کے مآخذ دین میں منسوخ شدہ آسمانی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ بھی شامل ہیں۔...ان کے نزدیک سابقہ شرائع کے اکثر و بیشتر احکامات اب بھی دین اسلام میں قانون سازی کا ایک بہت بڑا ماخذ ہیں۔''

(فکر غامدی ۶۰)

زیر نظر مضمون میں فاضل ناقد کے اعتراضات بنیادی طور پر اس مقدمے پر مشتمل ہیں کہ غامدی صاحب بائیبل کو مآخذ دین میں شمار کرتے اور قرآن وسنت کی طرح اس سے بھی دین و شریعت کے احکام اخذ کرتے ہیں۔ اس مقدمے کے حوالے سے فاضل ناقد نے جو دلائل پیش کیے ہیں، وہ ان نکات پر مبنی ہیں:

۱۔ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں لفظ 'کتاب' سے مراد تمام کتب سماویہ ہیں۔

۲۔ غامدی صاحب کے ایک شاگرد نے غامدی صاحب کی عبارت کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے بائیبل کو دین کے مصادر میں شمار کیا ہے۔

۳۔ بعض اطلاقی مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غامدی صاحب قدیم صحیفوں کو دین کا ماخذ تصور کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مثال ماہنامہ ''اشراق'' میں شائع ہونے والا مضمون ''اسلام اور موسیقی'' ہے۔ اس سے غامدی صاحب کا یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ دین کے کسی مسئلے میں قرآن کے اشارات کو بنیاد بنا کر قدیم صحائف کی تفصیلات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ دوسری مثال ''اسلام اور مصوری'' کے زیر عنوان ''اشراق'' میں شائع ہونے والا ایک مضمون ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن کے کسی مجمل لفظ کی شرح کتاب مقدس کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

آیات کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔تیسری مثال ''اشراق'' ہی میں شائع ہونے والا مضمون ''یاجوج و ماجوج'' ہے۔ اس سے غامدی صاحب کا یہ موقف سامنے آتا ہے کہ قرآن کے مبہمات کی وضاحت کے لیے بائیبل سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔

۴۔ غامدی صاحب ایک جانب بائیبل کو دین کا ماخذ قرار دیتے ہیں اور دوسری جانب اپنے اس اصول سے انحراف کرتے ہوئے کتاب مقدس سے ثابت شدہ عقائد و احکامات کا انکار کرتے ہیں۔اس انحراف کی ایک مثال سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کے بارے غامدی صاحب کا موقف ہے۔نزول مسیح کا اثبات قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ بائیبل سے بھی ہوتا ہے، مگر غامدی صاحب نے اس سلسلے میں بائیبل کے برعکس رائے قائم کی ہے۔ دوسری مثال دجال کی تعیین کے بارے میں غامدی صاحب کا نقطۂ نظر ہے۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال ایک فرد واحد ہے، جبکہ غامدی صاحب اسے اسم صفت قرار دے کر تہذیب مغرب کو اس سے موسوم کرتے ہیں۔ غامدی صاحب کے اپنے اصول سے انحراف کی تیسری مثال یہ ہے کہ وہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا کو تسلیم نہیں کرتے، جبکہ شادی شدہ زانی کے لیے یہ سزا بائیبل سے بھی ثابت ہے۔

یہ فاضل ناقد کا مجموعۂ دلائل ہے۔تمہیدی مباحث میں یہ بات ہر لحاظ سے فیصل ہوگئی ہے کہ غامدی صاحب پر اس الزام کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ وہ بائیبل کو دین کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔اس بحث کے بعد فاضل ناقد کے مذکورہ چاروں نکات بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔لیکن فاضل ناقد کے یہ نکات چونکہ بعض پہلوؤں سے خلط مبحث کا باعث ہو سکتے ہیں، اس لیے ان کے بارے میں ضروری توضیحات ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

ا۔ 'الکتاب' کا معنی اور مصداق

فاضل ناقد نے لکھا ہے:

''غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں لفظ ''کتاب'' سے مراد کلام الٰہی ہے، چاہے یہ تورات و انجیل کی شکل میں ہو یا قرآن و زبور کی صورت میں۔ان کے مآخذ دین میں منسوخ شدہ آسمانی کتابیں تورات و انجیل وغیرہم بھی شامل ہیں۔غامدی صاحب نے ''کتاب'' کا یہ مفہوم اپنے استاذ امام امین احسن اصلاحی صاحب سے لیا ہے۔لفظ کتاب کے اس نادر مفہوم کو غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' اور ان کے استاذ امام کی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں 'ذٰلك الکتٰب لا ریب فیه' کی تشریح میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''اصول و مبادی'' میں

www.javedahmadghamidi.com

کسی جگہ کتاب کی تعریف بیان نہیں کی۔ انھوں نے ''اصول ومبادی'' کے آغاز میں قرآن کی تعریف بیان کی ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن کتاب الٰہی کا ایک حصہ ہے، کل کتاب نہیں ہے۔ کتاب کے مفہوم میں ان کے نزدیک تورات، انجیل اور زبور وغیرہ بھی شامل ہیں۔'' (فکر غامدی ۵۹)

اس اقتباس میں فاضل ناقد نے حسب ذیل باتیں بیان کی ہیں:

اولاً، غامدی صاحب کے نزدیک 'ذلك الكتاب لا ريب فيه' میں 'کتاب' سے مراد صرف قرآن نہیں، بلکہ تمام الہامی صحائف ہیں۔

ثانیاً، ان کے نزدیک قرآن مجید کتاب الٰہی کا ایک حصہ ہے، مکمل کتاب نہیں ہے۔

ثالثاً، غامدی صاحب نے یہ مفہوم اپنے استاد مولانا امین احسن اصلاحی سے اخذ کیا ہے۔

رابعاً، یہ مفہوم مولانا اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' اور غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' میں 'ذلك الكتٰب لا ريب فيه' کی تشریح میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

فاضل ناقد کی یہ تمام باتیں حرف بحرف غلط ہیں۔ 'ذلك الكتٰب لا ريب فيه' میں 'الكتاب' کا مصداق مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب جاوید احمد غامدی، دونوں کے نزدیک قرآن مجید ہے۔ یہی مفہوم انھوں نے اپنی کتب ''تدبر قرآن'' اور ''البیان'' میں بیان کیا ہے۔ مولانا اصلاحی نے 'ذلك الكتٰب لا ريب فيه' کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ''یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں''۔ اس ترجمے ہی سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ یہاں 'الکتاب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ 'یہ' اور 'اس' کی ضمیریں اس مفہوم کے لیے صریح ہیں۔ جہاں تک لفظ 'کتاب' کے مختلف معانی کی بحث کا تعلق ہے تو یہ اس ممکنہ سوال کے پیش نظر کی گئی ہے کہ صاحب ''تدبر قرآن'' کے نزدیک اس لفظ کے دیگر معانی کے تقابل میں 'کلام الٰہی' کے معنی کو ترجیح دینے کا کیا سبب ہے۔ غالباً یہی وہ بحث ہے جس کے سوء فہم سے فاضل ناقد نے مذکورہ معنی اخذ کیے ہیں۔ یہ بحث حسب ذیل ہے:

''قرآن مجید میں کتاب کا لفظ پانچ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ نوشتۂ تقدیر۔ مثلاً 'لو لا كتٰب من الله سبق لمسكم فيما اخذتم عذاب عظيم' (۶۸۔ انفال) (اگر نوشتۂ الٰہی نہ گزر چکا ہوتا تو جس چیز میں تم مبتلا ہوئے اس کے باعث تمھیں ایک دردناک عذاب آ پکڑتا)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز کا ریکارڈ ہے۔ مثلاً 'وعندنا كتٰب حفيظ' (۴۔ ق) (اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے محفوظ رکھنے والی)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۳۔خط اور پیغام۔مثلاً 'انی القی الی کتٰب کریم' (۲۹۔النمل) (میرے پاس ایک گرامی نامہ بھجوایا گیا)۔

۴۔احکام وقوانین۔مثلاً 'و یعلمهم الکتٰب و الحکمة' (۲۔الجمعہ) (اوران کوشریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے)۔

۵۔اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام۔اپنے اسی معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کتاب الٰہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد کتاب الٰہی کا کوئی خاص حصہ بھی ہوا کرتا ہے اور اس کا مجموعہ بھی۔

مجموعہ کے مفہوم کے لیے نظیر اعراف کی یہ آیت ہے: 'والذین یمسکون بالکتٰب و اقاموا الصلوٰة' (۱۷۰۔الاعراف) (اور جو کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں)۔

دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے: 'الم تر الی الذین او توا نصیبا من الکتٰب یدعون الی کتٰب اللّٰہ لیحکم بینھم' (۲۲۔آل عمران) (ذرا دیکھو تو ان کو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا، ان کو دعوت دی جارہی ہے اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے)۔

جس طرح کوئی لفظ اپنے مختلف معنی میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر معنی کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے، اسی طرح یہ کتاب کا لفظ بھی خاص طور پر کتاب الٰہی کے لیے بولا جانے لگا۔ چنانچہ یہ استعمال قدیم زمانہ سے معروف ہے۔ یہود انبیا کے صحیفوں میں سے ہر صحیفہ کو سفر کہتے تھے جس کے معنی کتاب کے ہیں۔عیسائی مترجموں نے ان کتابوں کو بائیبل کا نام دیا، اس کے معنی بھی یونانی میں کتاب ہی کے ہیں۔اسی طرح ان صحیفوں کے لیے (scripture) کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی لاطینی میں کتاب کے ہیں۔الغرض کتاب کا لفظ کتاب اللہ کے لیے کوئی نیا استعمال نہیں ہے۔ یہ استعمال جیسا کہ واضح ہوا، بہت قدیم ہے۔قرآن نے بھی اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا اور اپنے استعمالات سے اس کے اس معنی کو اس قدر واضح کر دیا کہ اس کے مخاطب اس استعمال کو بے تکلف سمجھنے لگ گئے۔''

(تدبر قرآن ۱/۸۷)

مولانا اصلاحی نے اس مقام پر بلاشبہ، بائیبل کا ذکر بھی کیا ہے۔اس سے انھوں نے فقط یہ بات سمجھائی ہے کہ لفظ 'کتاب' کا اللہ کے کلام کے معنی میں استعمال ہونا، اس کا کوئی نیا استعمال نہیں ہے جسے قرآن نے ابتداءً اختیار کیا ہو۔قدیم زمانے میں بھی اللہ کے کلام کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ یہود صحیفۂ آسمانی کے لیے 'سفر' کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کے معنی 'کتاب' کے ہیں۔اسی طرح عیسائی مترجمین نے بھی صحف سماوی کے مجموعے کے لیے 'بائیبل' کا لفظ اختیار کیا جو 'کتاب' ہی کے ہم معنی ہے۔اس سے واضح ہے کہ مولانا اصلاحی کی یہ بحث لفظ

'کتاب' کے معنی کے بارے میں ہے، 'ذٰلك الكتٰب لا ريب فيه' میں اس کے مصداق کے بارے میں ہرگز نہیں ہے۔ ان کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ 'کتاب' کا لفظ قرآن میں جہاں نوشتۂ تقدیر، رجسٹر، مکتوب اور قانون کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، وہاں کلام الٰہی کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اور 'ذٰلك الكتٰب لا ريب فيه' میں لفظ 'کتاب' سے یہی معنی مراد ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بیان کیا ہے کہ 'لا ريب فيه' کے الفاظ بھی اسی معنی کی تاکید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''لا ريب فيه: 'ریب' کے معنی شک کے ہیں۔ ''اس میں کوئی شک نہیں ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے یا ایک کتاب منزل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ جملہ پہلے جملہ کی خبر نہیں، بلکہ اس کی تاکید ہے۔ 'ذٰلك الكتٰب' کے معنی ہیں، یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے بعد یہ تاکید اسی حقیقت کو مزید قوت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجایش نہیں ہے۔

اگر اس کے معنی یہ نہ لیے جائیں تو پھر اس ٹکڑے کے لیے یہاں کوئی موزوں موقع ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ قرآن مجید کے نظائر سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً اسی سورہ میں چند ہی آیات کے بعد فرمایا ہے: 'وان كنتم فى ريب مما نزلنا على عبدنا فاتوا بسورة من مثله' (۲۳۔ بقرہ) (اور اگر تم اس کی طرف سے شک میں جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی ایک سورہ)۔ 'الٓمّٓ تنزيل الكتٰب لا ريب فيه من رب العٰلمين' (۱۔ السجدہ) (آلم، کتاب کی تنزیل، جس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، عالم کے خداوند کی طرف سے)۔ 'حٰمٓ تنزيل الكتٰب من الله العزيز العليم' (۱-۲۔ مومن) (حٰم، کتاب کا اتارنا خدائے عزیز وعلیم کی طرف سے ہے)۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۸۷)

جہاں تک 'کتاب الٰہی' کے مصداق کا تعلق ہے تو درج بالا اقتباس سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ مولانا اصلاحی کے نزدیک یہ قرآن مجید ہی ہے۔ اس اقتباس میں تاکید مزید کے لیے جن دیگر آیات کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ بھی اسی مصداق کی تصدیق کرتی ہیں۔ 'وان كنتم فى ريب مما نزلنا على عبدنا فاتوا بسورة من مثله' کی شرح میں مولانا لکھتے ہیں:

''ان کے انھی خیالات کی بنا پر ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان یا جن کی گھڑی ہوئی چیز سمجھتے ہو تو اپنے ان حمایتیوں کی مدد سے اس کے مانند ایک ہی سورہ پیش کرو، اگر یہ تمھارے حمایتی اس نازک موقع پر بھی، جبکہ تمھارے آبائی دین کے ساتھ ساتھ خود ان کی خدائی بھی معرض خطر میں ہے، تمھاری مدد کے لیے نہ اٹھیں تو سمجھ لو کہ یہ قرآن خدائی کلام ہے اور تمھارے یہ سارے دیوی دیوتا بالکل بے حقیقت ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۱۳۸)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسی طرح 'الٓمّٓ تنزیل الکتٰب لا ریب فیه من رب العالمین' کی شرح میں یہ صریح جملہ بھی درج ہے کہ 'الکتٰب' سے مراد قرآن مجید ہے:

''الکتٰب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی اس کتاب کی تنزیل 'اَللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' کی طرف سے ہے۔ اس کے اللہ رب العٰلمین کی طرف سے ہونے میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں ہے۔ 'لَا رَیْبَ فِیْہِ' کا یہی مفہوم ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ اس آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قریش اور یہود، دونوں کو سب سے زیادہ اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے سے تھا کہ یہ کتاب آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جاتی ہے۔ اس دعوے کو وہ، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا 'افتراء' قرار دیتے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگاتے کہ نعوذ باللہ اس کتاب کو یہ تصنیف تو خود کرتے ہیں، لیکن ہمارے اوپر دھونس جمانے کے لیے اس کو جھوٹ موٹ منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۶/۱۵۵)

لفظ 'الکتاب' کے بعینہٖ یہ معنی جناب جاوید احمد غامدی نے بھی سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں اختیار کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اصل الفاظ ہیں: 'ذٰلك الكتٰب'۔ اس میں 'ذٰلك' کا اسم اشارہ سورہ کے لیے آیا ہے اور 'الکتٰب' کے معنی کتاب الٰہی کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اس معنی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اسی طریقے پر استعمال ہوا ہے، جس پر کوئی لفظ اپنے مختلف مفاہیم میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر مفہوم کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے۔

یعنی اس بات میں (کوئی شبہ نہیں) کہ یہ کتاب الٰہی ہے —— یہی اس جملے کا سیدھا اور صاف مفہوم ہے اور قرآن کے نظائر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔'' (اشراق، اکتوبر ۱۹۹۸، ۸)

'وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله' کی شرح میں بھی انھوں نے اس کا مصداق قرآن ہی کو قرار دیا ہے:

''مطلب یہ ہے کہ تم اگر اسے خدا کی کتاب نہیں سمجھتے تو اپنی ہدایت اور اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے جس شان کا یہ کلام ہے، اس شان کی کوئی ایک سورہ ہی بنا کر پیش کر دو۔ تمھارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمھاری قوم کے ایک فرد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے ہیں تو تمھیں بھی اس میں کوئی دقت نہ ہونی چاہیے۔ اپنے متعلق یہ قرآن کا چیلنج ہے جو اس نے اپنے اولین مخاطبین کو دیا اور ان میں سے کوئی بھی اس کا سامنا کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔'' (اشراق، مارچ ۱۹۹۹، ۹)

سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۴۸ میں بھی 'الکتٰب' کا یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مصداق بھی غامدی صاحب

www.javedahmadghamidi.com

کے نزدیک قرآن مجید ہی ہے۔[8]

۲۔ ''دین کے مصادر'' سے مراد

غامدی صاحب سے یہ بات منسوب کرنے کے لیے کہ بائیبل بھی مآخذ دین میں شامل ہے، فاضل ناقد نے دوسری دلیل کے طور پر راقم کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں یہ جملہ درج ہے کہ ''دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں''۔ اس جملے میں چونکہ قدیم صحائف کے لیے ''دین کے مصادر'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لہٰذا اس کی بنا پر فاضل ناقد نے یہ بیان کیا ہے کہ جناب جاوید احمد غامدی بائیبل کو دین کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ ''غامدی صاحب کا تصور فطرت ـــــ چند توضیحات'' کے زیر عنوان اپنے گزشتہ مضمون میں ہم نے فاضل ناقد کی اس دلیل کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور یہ گزارش کی ہے کہ ہماری رائے میں اس جملے کی بنا پر غامدی صاحب کے مآخذ دین میں بائیبل کو شامل کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ اس ضمن میں ہماری توضیحات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ یہ جملہ غامدی صاحب کا نہیں، بلکہ راقم کا ہے۔ فاضل ناقد کا ''فکر غامدی ایک تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ'' کے زیر عنوان غامدی صاحب پر تنقید کے لیے قلم اٹھانا اور اس مقصد کے لیے ان کے کسی شاگرد کی تحریر کا انتخاب کرنا تنقید ادب کے مسلمات کے منافی ہے۔

۲۔ غامدی صاحب نے اپنی تالیف ''اصول و مبادی'' میں مآخذ دین کے موضوع پر نہایت صراحت کے ساتھ بحث کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ان کے موقف کے مطابق دین صرف دو جگہوں سے اخذ کیا جائے گا: ایک قرآن اور دوسری سنت۔ ان کی اس تحریر کے ہوتے ہوئے مآخذ دین کی بحث کے لیے کسی اور کی تحریر کو بنیاد بنانا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

۳۔ راقم کے مذکورہ جملے کے تحت یہ درج ہے کہ اس موضوع پر مفصل بحث غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' میں ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس بحث میں غامدی صاحب نے مآخذ دین کو نہیں، بلکہ دین کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ دین کی تاریخ کی بحث سے ظاہر ہے کہ مآخذ دین کا مفہوم ہرگز اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ ''اسلام اور موسیقی'' کے زیر عنوان راقم کے جس مضمون سے مذکورہ جملہ اٹھایا گیا ہے، اس کی تمہید میں دین اخذ

۸۔ اصول و مبادی ۲۳۔

کرنے کے ذرائع کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں بیان ہوا ہے کہ دین میں کسی چیز کے جواز یا عدم جواز کے لیے فیصلہ کن حیثیت قرآن وسنت کو حاصل ہے۔اسی طرح یہ بھی بیان ہوا ہے کہ شریعت کے یقینی ذرائع کی حیثیت قرآن وسنت کو حاصل ہے۔تمہید میں مذکور اس تصریح کے ہوتے ہوئے مذکورہ جملے سے مآخذ دین کے معنی اخذ کرنے کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

۵۔راقم نے ''دین کے مآخذ'' کے نہیں، بلکہ ''دین کے مصادر'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔یہ تعبیر اختیار کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ کوئی شخص اس بحث کو مآخذ دین کی بحث پر محمول نہ کر لے۔اسلامی علوم میں دین اخذ کرنے کے ذرائع کے لیے ''مصادر'' کا نہیں، بلکہ ''مآخذ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔یہ لفظ ایک اصطلاح ہے جس کا ایک متعین مفہوم اور مصداق ہے۔مضمون کی تمہید میں شریعت اخذ کرنے کے ذرائع کا بیان، جملے کا سیاق وسباق اور غامدی صاحب کی محولہ عبارت جیسے واضح قرائن کے ہوتے ہوئے ''دین کے مصادر'' کے الفاظ سے ''مآخذ دین'' کی اصطلاح مراد لینا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۳۔'اطلاق' کی مثالیں

فاضل ناقد نے ''دین کے مصادر'' کے حوالے سے راقم کا مذکورہ اقتباس نقل کر کے اور اس کے مدعا کو جناب جاوید احمد غامدی سے منسوب کر کے ان کی نسبت سے بعض اصول وضع کیے ہیں اور ان کی تائید میں بعض اطلاقی مثالیں پیش کی ہیں۔ہمارے نزدیک یہ مثالیں جس مقدمے کے اثبات کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ غامدی صاحب بائیبل کو ماخذ دین قرار دیتے ہیں، وہ بذات خود غلط اور بے بنیاد ہے اور اس کی بے سروپائی کو ہم نے ابتدا میں دلائل سے واضح کر دیا ہے،لہٰذا ان پر اس ضمن میں تو کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کے بارے میں غامدی صاحب کا اصل موقف اور اس کا استدلال کیا ہے، البتہ ان کے بارے میں فاضل ناقد کی تنقید کے تناظر میں بعض ضروری توضیحات ناگزیر ہیں۔

فاضل ناقد نے اس مقدمے کے اثبات کے لیے کہ غامدی صاحب بائیبل کو ماخذ دین قرار دیتے ہیں جن تحریروں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے،ان میں ماہنامہ ''اشراق'' میں شائع ہونے والے دو مضامین بھی شامل ہیں۔ ایک مضمون کا عنوان ''اسلام اور موسیقی'' اور دوسرے کا ''اسلام اور مصوری'' ہے۔ان کی بنا پر فاضل ناقد نے یہ بیان کیا ہے کہ غامدی صاحب دین کے کسی مسئلے میں قرآن کے اشارات کو بنیاد بنا کر قدیم صحائف کی تفصیلات کی تصدیق

کرتے ہیں اور قرآن کے مجمل الفاظ کی تفصیلات جاننے کے لیے کتاب مقدس کی آیات سے رجوع کرتے ہیں۔

''اسلام اور موسیقی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فاضل ناقد نے لکھا ہے:

''اگر کسی مسئلے کے بارے میں قرآن میں اشارات موجود ہوں، یعنی لفظوں میں رہنمائی موجود نہ ہو تو قرآن میں وارد شدہ ان اشارات کو بنیاد بنا کر اسی مسئلے کے بارے میں کتب سماویہ کی تفصیلات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے مسئلۂ موسیقی کو ثابت کیا ہے۔

غامدی صاحب کے بقول کتاب مقدس سے موسیقی اور آلات موسیقی کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ زبور کا حوالہ دیتے ہوئے موسیقی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اے خداوند میں تیرے لیے نیا گیت گاؤں گا۔ دس تاروالی بربط پر میں تیری مدح سرائی کروں گا۔''

ایک دوسری جگہ کتاب مقدس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تو ایسا ہوا کہ جب نرسنگے پھونکنے والے اور گانے والے مل گئے تاکہ خداوند کی حمد اور شکرگزاری میں ان سب کی آواز سنائی دے اور جب نرسنگوں اور جھانجھوں اور موسیقی کے سب سازوں کے ساتھ انھوں نے اپنی آواز بلند کر کے خداوند کی ستایش کی کہ وہ بھلا ہے۔''

جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ہیں یا منسوخ نہیں ہیں؟ تو غامدی صاحب یہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن میں موسیقی کے جواز کے بارے میں اشارات موجود ہیں اور قرآن میں موجود یہ اشارات کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ یہ آیات نہ تو منسوخ ہیں اور نہ ہی غیر محفوظ، بلکہ ہمارے لیے شریعت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں قرآن مجید اصلاً خاموش ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جو موسیقی کی حلت و حرمت کے حوالے سے کسی حکم کو بیان کر رہی ہو۔ البتہ، اس میں بعض ایسے اشارات موجود ہیں جن سے موسیقی کے جواز کی تائید ہوتی ہے۔ ان کی بنا پر قرآن سے موسیقی کے جواز کا یقینی حکم اخذ کرنا تو بلاشبہ کلام کے اصل مدعا سے تجاوز ہوگا۔''

گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں، ان کے بقول، موسیقی کے حوالے سے وارد شدہ اشارات اس بات کی دلیل ہیں کہ موسیقی کے حوالے سے کتاب مقدس کی آیات محفوظ ہیں۔'' (فکر غامدی ۶۲، طبع اول)

''اسلام اور مصوری'' پر ان کا تبصرہ یہ ہے:

''اگر کسی مسئلہ کے بارے میں قرآن میں خبر کے انداز میں لفظوں میں سابقہ شرائع کے حوالے سے کوئی رہنمائی موجود ہو اور یہ الفاظ مجمل ہوں تو ان الفاظ قرآنیہ کی تفصیل کتاب مقدس کی آیات سے کی جاسکتی ہے۔ اس اصول

کے تحت غامدی صاحب نے قرآن میں موجود لفظ 'تماثیل' کی بائیبل کی آیات کی روشنی میں تفصیل کی ہے اور شیر، بیل اور ملائکہ کی تصاویر کو بھی کتاب مقدس کی روشنی میں صحیح قرار دیا ہے۔ بائیبل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور ان حاشیوں پر جو پڑوں کے درمیان تھے، شیر اور بیل اور کروبی (فرشتے) بنے ہوئے تھے۔''

ایک اور جگہ ہیکل کی تعمیر کے حوالے سے تورات کی آیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور الہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی (فرشتے) دس دس ہاتھ اونچے بنائے۔''

جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ تورات کی ان آیات کے محفوظ ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں حضرت سلیمان کے حوالے سے تماثیل کا ذکر موجود ہے۔ گویا کہ قرآن کے اجمالی الفاظ تورات کی ان تفصیلات کی تائید کر رہے ہیں۔'' (فکر غامدی ۶۳، طبع اول)

''غامدی صاحب کے بقول''، ''ایک جگہ... موسیقی کے حوالے سے لکھتے ہیں''، ''ایک دوسری جگہ کتاب مقدس کے حوالے سے لکھتے ہیں''، ''جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں... تو غامدی صاحب یہ جواب دیتے ہیں''، ''ایک جگہ لکھتے ہیں''، ''گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک''، ''ان کے بقول''، ''غامدی صاحب نے تفصیل کی ہے''، ''تورات کی آیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں''، ''جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں تو وہ جواب میں فرماتے ہیں'' —— یہ فاضل ناقد کے الفاظ ہیں جو انھوں نے غامدی صاحب کی نسبت سے بیان کیے ہیں۔ قارئین یہ جان کر ششدر رہ جائیں گے کہ ان میں سے کوئی ایک لفظ بھی غامدی صاحب کے قلم سے نہیں نکلا۔ —— خامہ انگشت بدنداں ہے، اسے کیا لکھیے!

یہ ساری تقریر غامدی صاحب کی تحریر کو نہیں، بلکہ راقم کے مضامین ''اسلام اور موسیقی'' اور ''اسلام اور مصوری'' کو بنیاد بنا کر کی گئی ہے۔ ''اشراق'' کے صفحات میں ان کے مصنف کے طور پر غامدی صاحب کا نہیں، بلکہ راقم کا نام درج ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''فکر غامدی ایک تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ'' کے زیر عنوان لکھی جانے والی تنقید میں اس کی کیا گنجایش ہے کہ غامدی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے سیکڑوں صفحوں سے قطع نظر کر کے ان کے رفقا و تلامذہ کی تحریروں کو منتخب کیا جائے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فاضل ناقد نے فقط یہی نہیں کیا کہ غامدی صاحب پر تنقید کے لیے ان کی اپنی تحریر کے بجائے ان کے شاگردوں کی تحریر کو بنیاد بنایا ہے، بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر شاگردوں کی تحریر کو غامدی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ قرار دے ڈالا ہے۔ یہ اسلوب تنقید ہے جو فاضل ناقد نے اپنے مضمون میں جابجا اختیار کیا ہے۔ فاضل ناقد صاحب علم بھی ہیں اور صاحب ایمان بھی۔ توقع ہے کہ وہ اس سوال پر

ضرور غور فرمائیں گے کہ علم و عقل اور دین و اخلاق کی رو سے اس طرز استدلال کی کیا گنجایش ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ راقم کے مضامین ''اسلام اور موسیقی'' اور ''اسلام اور مصوری'' غامدی صاحب ہی سے بالاجمال اخذ و استفادے پر مشتمل ہیں اور اسی بنا پر ان کے عنوانات کے ساتھ ''جناب جاوید احمد غامدی کے افادات پر مبنی'' اور ''جناب جاوید احمد غامدی کا نقطۂ نظر'' کی تصریح کی گئی ہے، لیکن ان کے اوپر مصنف کے طور پر راقم کا نام درج ہے۔ یہ علم و ادب کا مسلمہ ہے اور اس کی مثالوں سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں کہ مصنفین اپنے اساتذہ اور دیگر اہل علم کے افکار سے اخذ و استفادہ کرتے، ان کی بنا پر تصانیف رقم کرتے اور پھر انھی کی نسبت سے کوئی عنوان قائم کر کے انھیں شائع کرتے ہیں۔ تحریر و تصنیف کی دنیا میں اس کے معنی صرف اور صرف یہ ہوتے ہیں کہ مصنف نے اپنے استاذ یا کسی اور صاحب علم کے تصور، موقف، نقطۂ نظر یا تحقیق کو اپنے فہم کے مطابق، اپنے زاویۂ نظر سے، اپنے دلائل کی بنا پر اور اپنے پیرایۂ بیان میں تصنیف کیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ یہ عین بہ عین اس استاذ یا صاحب علم کی نگارش ہے اور اس کے افکار کے تجزیے کے لیے اسے بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ تفہیم مدعا کے لیے ''اشراق'' کے مضامین میں سے اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔ دیکھیے، تصویر کی حلت و حرمت کے بارے میں رائج نقطۂ نظر پر تنقید کے حوالے سے ''اشراق'' میں دو مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ایک ۱۰۰ صفحات پر مشتمل جناب رفیع مفتی صاحب کا مضمون ''تصویر کا مسئلہ'' ہے اور دوسرا راقم کا مضمون ''اسلام اور مصوری'' ہے جس کی ضخامت ۹۰ صفحات ہے۔ دونوں میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ جناب جاوید احمد غامدی کے افکار پر مبنی ہیں۔ گویا یہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی موقف کی ترجمان دو تحریریں ہیں۔ اس ہم آہنگی کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا طرز استدلال بھی مختلف ہے اور پیرایۂ بیان بھی، یہاں تک کہ نتیجۂ فکر کے لحاظ سے بھی بعض لطیف اختلاف موجود ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ ایک ہی موقف کو بیان کرنے کے لیے جب دو مختلف مصنفین نے قلم اٹھایا ہے تو ان میں فرق واقع ہو گیا ہے۔ اس فرق کا باعث ظاہر ہے کہ مصنفین کا فہم اور زاویۂ نظر ہے نہ کہ وہ موقف جسے انھوں نے یکساں طور پر بیان کیا ہے۔ چنانچہ ان تحریروں کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کے لکھنے والوں نے ان میں اپنے فہم کے لحاظ سے غامدی صاحب ہی کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے تو یہ بالکل بجا ہو گا، لیکن اگر کوئی شخص ان کے بارے میں یہ حکم لگاتا ہے کہ ان کا لفظ لفظ غامدی صاحب کے موقف کا ترجمان ہے تو اسے کوئی بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر فاضل ناقد کی طرح اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ غامدی صاحب ہی کی تصنیف ہیں اور ان کے مندرجات کی بنا پر غامدی صاحب پر تنقید کے لیے قلم اٹھاتا اور ''فکر غامدی ـــــ ایک تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ'' جیسی کتاب تصنیف

کر دیتا ہے تو اس کی خدمت میں یہی گزارش کی جائے گی کہ یہ چیز تنقید ادب کے مسلمات کے منافی ہے کہ کسی صاحب علم پر تنقید کے لیے اس کی اپنی تصنیفات کو چھوڑ کر اس کے موقف پر مبنی کسی اور مصنف کی تحریر کو بنیاد بنایا جائے۔ علم و ادب کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ اقبال کے فکر پر تنقید کے لیے قلم اٹھایا جائے اور ''بانگ درا'' اور ''بال جبریل'' کے بجائے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی تصنیف ''فکر اقبال'' کو بنائے تنقید بنایا جائے۔

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ واضح رہے کہ راقم کے مضامین ''اسلام اور موسیقی'' اور ''اسلام اور مصوری'' میں بائیبل کے مندرجات کو اباحت کی دلیل کے طور پر ہرگز پیش نہیں کیا گیا۔ یہ بیانات ان فنون لطیفہ کے فی نفسہٖ مباح ہونے کی تائید میں استشہاداً پیش کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ان میں بائیبل کے وہ مقامات بھی نقل کیے ہیں جن میں ان فنون لطیفہ کا ذکر مثبت طور پر ہوا ہے اور وہ بھی نقل کیے ہیں جن میں ان کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کتب احادیث سے بھی حلت و حرمت، دونوں طرح کی روایتیں اسی اصول کو واضح کرنے کے لیے نقل کی گئی ہیں۔ ان فنون لطیفہ کی اباحت کے بارے میں ہماری یہ رائے اصلاً بائیبل کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس اصول پر مبنی ہے کہ جس چیز میں فی نفسہٖ عقیدہ و اخلاق کی قباحت موجود نہ ہو، اسے علی الاطلاق حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم کسی اضافی سبب کی بنا پر اسے ممنوع قرار دینا بالکل بجا ہے۔ لیکن اس صورت میں ظاہر ہے کہ ممانعت کا باعث وہ اضافی سبب ہی قرار پائے گا نہ کہ بذات خود وہ چیز۔ چنانچہ کسی ایسی چیز کے بارے میں جسے دین نے فی نفسہٖ حرام قرار نہ دیا ہو، حرمت کا فتویٰ صادر کرنا شریعت سے تجاوز ہے۔ مذکورہ مضمون میں ہم نے اپنے استدلال کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فاضل ناقد اگر اس کو موضوع بنا کر اس پر بحث کریں تو ان شاء اللہ ہم اپنے استدلال کی مزید وضاحت کر دیں گے۔

''اسلام اور موسیقی'' اور ''اسلام اور مصوری'' کے حوالے سے اطلاقی مثالوں کے علاوہ فاضل ناقد نے ''یاجوج و ماجوج'' کی مثال بھی پیش کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ غامدی صاحب نے قرآن کے الفاظ 'یاجوج و ماجوج' کے مصداق کے تعین کے لیے بائیبل سے رجوع کیا ہے۔

اس ضمن میں ہماری گزارش یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یاجوج و ماجوج کے مصداق کا تعین کسی طرح بھی 'دین' کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایک تاریخی بحث ہے جس کے لیے دیگر تاریخی مآخذ کے ساتھ ساتھ بائیبل سے بھی استشہاد کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر موضوعات پر بائیبل سے استشہاد تاریخ، سیرت اور تفسیر کے علما کا معمول بہ عمل

ہے۔اس سے بائیبل کو ماخذ دین سمجھنے کا تصور ہر گز قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ اگر کوئی مفسر بدر، احد، خندق، فتح مکہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے متعلق قرآنی آیات کی شرح و وضاحت کے لیے ''سیرت ابن ہشام'' اور ''طبقات ابن سعد'' سے واقعات کی تفصیلات حاصل کرے تو اس پر یہ الزام عائد کر دیا جائے کہ اس نے ''سیرت ابن ہشام'' اور ''طبقات ابن سعد'' کو دین کا ماخذ قرار دے ڈالا ہے۔اس الزام کی علم و عقل کی دنیا میں کیا حیثیت ہو گی، قارئین اس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے چند اقتباس بطور مثال درج ذیل ہیں۔اس سے فاضل ناقد کو امید ہے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو گی کہ تاریخی موضوعات پر بائیبل سے مراجعت کے یہ معنی ہر گز نہیں ہوتے کہ اس سے دین اخذ کیا جا رہا ہے:

''حضرت یحییٰ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں انھیں جمع کر کے ہم یہاں ان کی سیرت پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے سورۂ آل عمران اور اس سورہ (مریم) کے مختصر اشارات کی توضیح ہو گی....'' (تفہیم القرآن ۳/۶۱)

''(حضرت زکریا کے) اس واقعے کی تفصیلات لوقا کی انجیل میں بیان ہوئی ہیں انھیں ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں...'' (تفہیم القرآن ۳/۵۹)

''یاجوج ماجوج سے مراد ایشیا کے شمال مشرقی علاقے کی وہ قومیں ہیں جو قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر غارت گرانہ حملے کرتی رہی ہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رخ کرتے رہے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش (باب ۱۰) میں ان کو حضرت نوح کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے اور یہی بیان مسلمان مورخین کا بھی ہے۔حزقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸، ۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور توبل (موجودہ توبالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔'' (تفہیم القرآن ۳/۴۶)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ یاجوج و ماجوج کے مصداق کا تعین کسی طرح بھی 'دین' کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ علم تاریخ کی ایک بحث ہے جس کے لیے باقی تاریخی مآخذ کے ساتھ ساتھ بائیبل سے بھی استشہاد کیا جا سکتا ہے۔ جناب جاوید احمد غامدی نے بھی اسی پہلو سے بائیبل کے حوالے نقل کیے ہیں۔

۴۔ ''انحراف'' کی مثالیں

فاضل ناقد نے مضمون کے آخر میں ''غامدی صاحب کا اپنے اصولوں سے انحراف'' کا عنوان قائم کر کے یہ حکم لگایا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے کہ غامدی صاحب ان مسائل میں تو بائیبل کو بنائے استدلال بناتے ہیں جو ان کے نظریات کے موافق ہیں، لیکن جن مسائل میں بائیبل ان کے نظریات کی مخالف ہے، ان میں وہ اس سے رجوع کرنے سے گریز کرتے ہیں اور نتیجۃً بائیبل کو ماخذ دین قرار دینے والے اپنے ہی اصول سے منحرف ہوتے ہوئے ان عقائد و احکام کا انکار کر دیتے ہیں جن کی تائید بائیبل بھی کرتی ہے۔ اس تقریر کے اثبات کے لیے انھوں نے تین مثالیں پیش کی ہیں۔ پہلی مثال یہ پیش کی ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کا اثبات قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ بائیبل سے بھی ہوتا ہے، مگر غامدی صاحب اس سلسلے میں بائیبل سے رہنمائی نہیں لیتے اور عملاً اس تصور کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ دوسری مثال یہ بیان کی ہے کہ بائیبل سے احادیث کی اس خبر کی تصدیق ہوتی ہے کہ قرب قیامت میں ایک شخص دجال ظاہر ہوگا۔ بائیبل کی اس تصدیق کے باوجود غامدی صاحب دجال کو شخص ماننے سے انکار کرتے اور اسے اسم صفت قرار دے کر تہذیب مغرب کو اس سے موسوم کرتے ہیں۔ تیسری مثال رجم کی سزا کے بارے میں غامدی صاحب کے نقطۂ نظر کے حوالے سے ہے۔ فاضل ناقد کے نزدیک غامدی صاحب شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا کو تسلیم نہیں کرتے، جبکہ یہ سزا بائیبل سے بھی پوری طرح ثابت ہے۔ گویا غامدی صاحب ایک جانب بائیبل کو ماخذ دین قرار دیتے ہیں اور دوسری جانب اس کے شادی شدہ زانی پر رجم کی سزا نافذ کرنے کے حکم کو تسلیم نہیں کرتے۔

''انحراف'' کی یہ تینوں مثالیں فاضل ناقد نے اس مزعومہ مقدمے کو مان کر پیش کی ہیں کہ غامدی صاحب بائیبل کو ماخذ دین قرار دیتے ہیں۔ تمہید میں یہ بات ہر لحاظ سے ثابت ہوگئی ہے کہ فاضل ناقد کا مزعومہ مقدمہ سرتاسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ جب مقدمہ ہی غلط ہے تو اس سے انحراف کی تقریر بالکل بے معنی اور غیر متعلق ہے، لہٰذا اس کے بارے میں بحث و تمحیص سرتاسر اضافی ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں ہم ان مثالوں سے قطع نظر کر رہے ہیں۔ البتہ فاضل ناقد کی اصولی تنقیدات پر اپنا تبصرہ مکمل کرنے کے بعد ہم ان شاء اللہ انھیں ان کی انفرادی حیثیت میں ضرور زیر بحث لائیں گے اور اس سوءِ فہم اور خلط مبحث کو واضح کریں گے جو ان مثالوں کے حوالے سے فاضل ناقد کی تحریر میں مضمر ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اُسے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کا خلاصہ ہے جس میں کتاب کا نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

—— جاوید

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دین حق

دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اُس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی اور اِس کے بعد اُس کی تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے۔ اِس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ دین کا تنہا ماخذ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے اور دین حق اب وہی ہے جسے آپ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب* سے دین قرار دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع** اور قولی و عملی تواتر*** سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے:

۱۔ قرآن مجید

۲۔ سنت

قرآن مجید وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے اور اپنے نزول کے

---

* اِس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز دین کی حیثیت سے آپ کے سامنے ہوئی اور آپ نے اُس سے منع نہیں کیا۔

** یعنی بغیر کسی اختلاف کے پورے اتفاق کے ساتھ۔

*** یعنی بغیر کسی انقطاع کے نسل در نسل پڑھتے اور اُس پر عمل کرتے ہوئے۔

بعد سے آج تک مسلمانوں کے پاس اُن کی طرف سے اِس صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور جسے آپ کے صحابہ نے اپنے اجماع اور قولی تواتر کے ذریعے سے پوری حفاظت کے ساتھ بغیر کسی ادنیٰ تبدیلی کے دنیا کو منتقل کیا ہے۔

سنت دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تجدید واصلاح کے بعد* اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔

اِس میں اور قرآن مجید میں ثبوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اِسی طرح اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے۔

اِس دین کی حقیقت اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو قرآن کی اصطلاح میں وہ اللہ کی ''عبادت'' ہے۔ اِس کے معنی عاجزی اور پستی کے ہیں۔ یہ چیز اگر اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کے ساتھ پیدا ہو تو اپنے آپ کو انتہائی محبت اور انتہائی خوف کے ساتھ اُس کے سامنے آخری حد تک جھکا دینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک داخلی کیفیت ہے۔ خدا کا ذکر، اُس کا شکر، اُس کی ناراضی کا خوف، اُس کے ساتھ اخلاص، اُس پر بھروسا اور اُس کے حضور میں تسلیم ورضا اِس کیفیت کے باطنی مظاہر ہیں۔ انسان کے ظاہری وجود میں یہی چیز پرستش کے مظاہر، یعنی رکوع وسجود، تسبیح وتحمید، دعا ومناجات اور نذر ونیاز کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ پھر انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس وجہ سے اپنے اِس ظہور سے آگے بڑھ کر یہ انسان کے اُس عملی وجود سے متعلق ہوتی اور پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اُس وقت یہ انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ ظاہر وباطن، دونوں میں وہ خدا کا بندہ بن کر رہے۔

اللہ اور بندے کے درمیان عبد ومعبود کے اِس تعلق کے لیے یہ عبادت جب اپنی اساسات متعین کرتی، مراسم طے کرتی اور دنیا میں اِس تعلق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حدود وقیود مقرر کرتی ہے تو قرآن کی زبان میں اُسے دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسانوں پر واضح کی ہے، قرآن اُسے 'الدین' کہتا ہے اور اُس کے بارے میں اُنھیں ہدایت کرتا ہے کہ وہ اُسے بالکل درست اور اپنی زندگی میں پوری طرح برقرار رکھیں اور اُس میں کوئی تفرقہ پیدا نہ کریں۔

---

* یعنی جو بھلایا جا چکا تھا، اُسے تازہ کرنے اور جس میں کوئی غلطی ہو رہی تھی، اُس کو درست کرنے کے بعد۔

اِس عبادت کے لیے ایمان واخلاق کی جو اساسات خدا کے اِس دین میں بیان ہوئی ہیں، اُنھیں قرآن 'الحکمة' اور اِس کے مراسم اور حدود و قیود کو 'الکتاب' کہتا ہے۔ اِس کے لیے ایک دوسرا لفظ ''شریعت'' بھی ہے۔ اِس کے معنی وہی ہیں جو ہم لفظ قانون سے ادا کرتے ہیں۔

'الحکمة' ہمیشہ سے ایک ہی ہے، لیکن شریعت انسانی تمدن میں ارتقا اور تبدیلیوں کے باعث، البتہ بہت کچھ مختلف رہی ہے۔

الہامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں زیادہ تر شریعت اور انجیل میں حکمت بیان ہوئی ہے۔ زبور اِسی حکمت کی تمہید میں اللہ تعالیٰ کی تمجید کا مزمور ہے اور قرآن اِن دونوں کے لیے ایک جامع شہ پارۂ ادب اور صحیفۂ انذار و بشارت کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔

'الحکمة' کی تعبیر جن مباحث کے لیے اختیار کی گئی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں:

ایک، ایمانیات۔

دوسرے، اخلاقیات۔

'الکتاب' کے تحت جو مباحث بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ قانون عبادات۔ ۲۔ قانون معاشرت۔ ۳۔ قانون سیاست۔ ۴۔ قانون معیشت۔ ۵۔ قانون دعوت۔ ۶۔ قانون جہاد۔ ۷۔ حدود و تعزیرات۔ ۸۔ خورونوش۔ ۹۔ رسوم و آداب۔ ۱۰۔ قسم اور کفارۂ قسم۔

یہی سارا دین ہے۔ خدا کے جو پیغمبر اِس دین کو لے کر آئے، اُنھیں نبی کہا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے بعض ''نبوت'' کے ساتھ ''رسالت'' کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔

''نبوت'' یہ ہے کہ انسانوں میں سے کوئی شخص وحی پا کر لوگوں کو حق بتائے اور اُس کے ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری دے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبردار کرے۔ قرآن اِسے ''انذار'' اور ''بشارت'' سے تعبیر کرتا ہے۔

''رسالت'' یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اِس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اُس کی قوم اگر اُسے جھٹلا دے تو اُس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اِسی دنیا میں اُس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اُس پر قائم کر دے۔

اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو اپنی جزا و سزا کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اِس سے انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے خدا کی نشانی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ سر کی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ ''شہادت'' ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں 'شاھد' اور 'شھید' اِسی بنا پر کہا گیا ہے۔

شہادت کا یہ منصب رسولوں کے علاوہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو بھی عطا ہوا ہے۔ قرآن نے اِسی کے پیش نظر اُنھیں خدا کے رسول اور اُس کے بندوں کے درمیان ایک جماعت قرار دیا اور بتایا ہے کہ اِس منصب کے لیے وہ اُسی طرح منتخب کیے گئے جس طرح انسانوں میں سے اللہ تعالیٰ بعض ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نبیوں اور رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بالعموم اپنی کتابیں بھی نازل فرمائی ہیں۔ اِن کے نزول کا مقصد قرآن مجید میں یہ بیان ہوا ہے کہ حق و باطل کے لیے یہ میزان قرار پائیں تاکہ اِن کے ذریعے سے لوگ اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور اِس طرح حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔

نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا ہے۔ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وحی و الہام کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کو دین پر قائم رکھنے کے لیے ''انذار'' کی ذمہ داری اب قیامت تک اِس امت کے علما ادا کریں گے۔

اِس انذار کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ یہ قرآن کے ذریعے سے کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِسی بنا پر پوری دنیا کے لیے نذیر ہیں اور علما درحقیقت آپ ہی کے اِس انذار کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

اِس دین کا نام ''اسلام'' ہے اور اِس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ انسانوں سے وہ اِس کے سوا ہرگز کوئی دوسرا دین قبول نہ کرے گا۔

''اسلام'' کا لفظ جس طرح پورے دین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اِسی طرح دین کے ظاہر کو بھی بعض اوقات

اِسی لفظ اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے اِس ظاہر کے لحاظ سے یہ پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اِس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

۲۔ نماز قائم کی جائے۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۴۔ رمضان کے روزے رکھے جائیں۔

۵۔ بیت اللہ کا حج کیا جائے۔

دین کا باطن ایمان ہے۔ اِس کی جو تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس کی رو سے یہ بھی پانچ ہی چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اللہ پر ایمان۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان۔

۳۔ نبیوں پر ایمان۔

۴۔ کتابوں پر ایمان۔

۵۔ روز جزا پر ایمان۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ ایمان جب اپنی حقیقت کے اعتبار سے دل میں اترتا اور اُس سے اپنی تصدیق حاصل کر لیتا ہے تو اپنے وجود ہی سے دو چیزوں کا تقاضا کرتا ہے:

ایک عمل صالح،

دوسرے 'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر'۔

عمل صالح سے مراد ہر وہ عمل ہے جو تزکیۂ اخلاق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اِس کی تمام اساسات عقل وفطرت میں ثابت ہیں اور خدا کی شریعت اِسی عمل کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر' کے معنی اپنے ماحول میں ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کے ہیں۔ قرآن نے اِس کو ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو عقل وفطرت کی رو سے معروف ہیں، اپنے قریبی ماحول میں لوگوں کو اُن کی تلقین کی جائے اور جو منکر ہیں، اُن سے لوگوں کو روکا جائے۔

عام حالات میں ایمان کے تقاضے یہی ہیں، لیکن انسان جس دنیا میں رہتا ہے، اِس کے لحاظ سے جو حالتیں اُس کو

پیش آسکتی ہیں، اُن کی رعایت سے اِن کے علاوہ تین اور تقاضے بھی اِس سے پیدا ہوتے ہیں:

ایک ہجرت،

دوسرے نصرت،

تیسرے قیام بالقسط۔

بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے؛ اُسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ اپنے اسلام کو ظاہر کرنا ہی اُس کے لیے ممکن نہ رہے تو اُس کا یہ ایمان اُس سے تقاضا کرتا ہے کہ اِس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن اِسے ''ہجرت'' کہتا ہے اور پیغمبر کی طرف سے اِس کی دعوت کے بعد اپنے آپ کو اِس طرح کی صورت حال میں دیکھ کر اِس سے گریز کرنے والوں کو اُس نے دوزخ کی وعید سنائی ہے۔

اِسی طرح دین کو اپنے فروغ یا اپنی حفاظت کے لیے اگر کسی اقدام کی ضرورت پیش آجائے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ جان و مال سے دین کی مدد کی جائے۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ خدا کی ''نصرت'' ہے اور اُس کا مطالبہ ہے کہ ایمان کا یہ تقاضا اگر کسی وقت سامنے آجائے تو بندۂ مومن کو دنیا کی کوئی چیز بھی اِس سے زیادہ عزیز نہیں ہونی چاہیے۔

پھر اِس دنیا میں انسان کے جذبات، تعصّبات، مفادات اور خواہشیں اگر دین و دنیا کے کسی معاملے میں اُسے انصاف کی راہ سے ہٹا دینا چاہیں تو یہی ایمان تقاضا کرتا ہے کہ بندۂ مومن نہ صرف یہ کہ حق و انصاف پر قائم رہے، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو جان کی بازی لگا کر اِن کا یہ مطالبہ پورا کرے۔ حق کہے، حق کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ انصاف کرے، انصاف کی گواہی دے اور اپنے عقیدہ و عمل میں انصاف کے سوا کبھی کوئی چیز اختیار نہ کرے۔ قرآن نے اِس کے لیے ''قیام بالقسط'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

اِس دین کا جو مقصد قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ قرآن کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آلایشوں سے پاک کر کے اُس کے فکر و عمل کو صحیح سمت میں نشو و نما دی جائے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ انسان کا نصب العین بہشت بریں کی بادشاہی ہے اور کامیابی کے اِس مقام تک پہنچنے کی ضمانت اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو اِس دنیا میں اپنا تزکیہ کر لیں۔ لہٰذا دین میں غایت اور مقصود کی حیثیت تزکیہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ کے نبی اِسی مقصد کے لیے بھیجے گئے اور سارا دین اِسی مقصود کو پانے اور اِسی غایت تک پہنچنے میں انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

اِس دین پر عمل کے لیے جو رویہ اِس کے ماننے والوں کو اختیار کرنا چاہیے، وہ ''احسان'' ہے۔ احسان کے معنی کسی کام کو اُس کے بہترین طریقے پر کرنے کے ہیں۔ اِس کی صورت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی اِس طرح کرے کہ گویا وہ اُسے دیکھ رہا ہے، اِس لیے کہ اگر وہ اُسے نہیں دیکھ رہا تو اُس کا پروردگار تو اُسے دیکھ رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net